تسبیح

(ناول)



بیا علی

تسبیح ......ایک ادنیٰ سی کاوش ہے اُن لوگوں کو بے نقاب کرنے کی جو دنیا بھر میں اسلام اور اہل اسلام کو بدنام کرنے میں سرگرم عمل ہیں

تسبیح

مصنفہ : بیا علی

علم وعرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔اُردو بازار، لاہور

فون042-7352332-7232336

نوٹ:

محترمہ بیا علی ایک نئی لکھنے والی ہیں اور انہیں آپ کی مثبت تنقید اور حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔ اس کتاب پر تبصرہ ضرور کیجیے گا۔

انتساب!

اپنی والدہ کے نام جن کی محنت کی بدولت آج میں اس قابل ہو پائی
ہوں کہ قلم کے سہارے اپنے خیالات کا اظہار کر سکوں۔

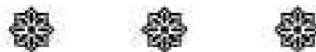
ابتدائیہ

تسبیح اُن لوگوں کو بے نقاب کرنے کی ایک ادنٰی سی کاوش ہے جو دنیا بھر میں اسلام اور اہل اسلام کو بدنام کرنے میں سرگرم عمل ہیں۔ یہ لوگ خدانخواستہ اسلام کو مٹانا چاہتے ہیں۔ دنیا اور خود مسلمانوں کے دلوں میں اسلامی تعلیمات کو غیر انسانی بنا کر پیش کرنے کے لئے انہوں نے مسلمانوں کا روپ دھار رکھا ہے۔ یہ لوگ حقیقتاً اپنے حلیے اور عمل سے کسی صورت بھی غیر مسلم نظر نہیں آتے۔

اسی بہروپ سے استفادہ کرتے ہوئے ان ملک دشمن عناصر نے ہمارے ہی ملک کے معصوم لاعلم اور مصیبت زدہ طبقے کو اپنے چنگل میں پھانس لیا ہے۔ یہ محروم طبقہ اپنی لاعلمی کی بنا پر اپنے اس گھناونے فعل کو جس کے ارتقاب کے نتیجے میں تقریباً روزانہ ملک بھر میں سینکڑوں معصوم اور بے گناہ مرد خواتین اور بچے شہید ہو جاتے ہیں اپنے لیے جنت کے حصول کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔

اپنی اور دوسروں کی جانوں سے کھیلنے والے یہ خودکش حملہ آور اسلام کی اصل روح اور تعلیمات سے بے بہرہ ہیں۔ یہ اسی غفلت اور لاعلمی کا نتیجہ ہے کہ وہ دین اور اہل دین کے لیے خوف وحراست کے علاوہ خطرے کا باعث بن چکے ہیں۔ آنکھوں کو اشکبار اور گھروں کو ماتم کدہ بنانے والے جنت کے طلبگار یہ بھول چکے ہیں کہ جس نے ایک انسان کا قتل کیا اس نے گویا تمام انسانیت کا قتل کیا۔ ملکی سلامتی کے لئے خطرہ بننے والوں میں چند مفاد اور زر پرست لوگ بھی شامل ہیں۔ زر پرست ہونے کے علاوہ یہ جہالت کے اندھیرں میں بھی گھرے ہوئے ہیں۔ اسی جہالت کی بنا پر وہ اپنے فعل کو دین کی خدمت کا نام دیتے ہیں اور یہ تصور کرتے ہیں کہ یہ دولت کی ریل پیل اور کامیابیاں اسی خدمت کا ثمر ہیں۔

اسلامی تعلیمات کی اشاعت نے اب ان کے دلوں میں ملال پیدا کر دیا ہے مگر وہ ابھی بھی ان نقاب پوشوں کے اصل چہروں سے غافل ہیں۔ تسبیح کے مطالعے سے یہ پہلو بھی اجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے کہ معاشرے کے پسے ہوئے طبقوں کو جب ان کے حقوق سے محروم کر دیا جائے تو بسا اوقات وہ ان کے حصول کے لیے غلط لوگوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور ان کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر ملکی سلامتی کے لیے خطرہ بن جاتے ہیں۔



آمنہ نے چائے کپوں میں اُنڈیلی اور کپ اُٹھائے اس کمرے میں آ گئی جہاں سکینہ کپڑوں کی کانٹ چھانٹ میں مصروف تھی ایک کپ آہستہ سے بیڈ کے قریب پڑی میز پہ رکھا اور پھر انہی دبے قدموں کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آئی جن کے ساتھ وہ اندر داخل ہوئی تھی۔ کمرے سے چند قدم دور جا کے اُس نے اونچی آواز میں کہا:

''امی چائے پی لیجیے کپ آپ کے قریب ہی رکھا ہے''۔

سکینہ جو اپنے دھیان سے کام کر رہی تھی بیٹی کی آواز سن کے اِدھر اُدھر دیکھتی ہے۔

''امی کپ چھوٹی میز پر رکھا ہے''۔

تب اس کی نظر میز پر پڑی۔ وہاں پڑے کپ کو دیکھ کر ہلکا سا مسکرائی اور خود سے کہنے لگی۔

''خدا کی پناہ...... کام کرنے کو جی نہ چاہے تو ایسی صفائی سے نکل جاتی ہے کہ انسان کی عقل دنگ رہ جائے۔...... یقیناً دیکھ لیا ہوگا کہ ماں کام میں مگن ہے کہیں میں قابو نہ آ جاؤں...... ویسے سوچنے کی بات ہے آخر یہ لڑکی آئی کب...... کام کاج کوئی ہے نہیں بس دن رات ٹی وی ہوتا ہے یا آمنہ صاحبہ......(ذرا سنجیدہ لہجے میں) میکے میں چار دن عیش کر لے جانے سسرال کیسا ملے۔''

آمنہ ہاتھ میں ریموٹ لیے چینل گھمانے میں مصروف تھی۔ مگر اس کی پسند کا کوئی بھی پروگرام نہ تھا۔ غصے سے ریموٹ صوفے پر رکھ دیا اور چائے پینے لگی۔ جب چائے ختم ہو چکی تو جانے من میں کیا آیا۔ ایک بار پھر ریموٹ سے ٹی وی کو گھمانے لگی۔ تھک ہار کے اسے آف کرنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ ایک نیوز چینل پہ آ کے ہاتھ رُک گیا۔ نظریں جم گئیں اور کان کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

''ابھی جوائن کرنے والوں کو ایک بار پھر سے بتاتے چلیں کہ صبح جی۔ پی۔ او چوک کے قریب خودکش حملے میں مرنے والوں کی تعداد "24" ہو گی ہے۔ جبکہ زخمیوں کی تعداد 320 بتائی جا رہی ہے۔

اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ایسا منظر تھا جہاں صرف اور صرف ماتم دکھائی دیتا تھا۔ چاروں طرف انسانی جسم کے لوتھڑے پڑے تھے۔ عمارات ملبے کا ڈھیر بنی ہوئی تھیں۔ فضا میں سوز و گداز تھا۔ آہیں اور سسکیاں تھیں۔ آنسو کی رم جھم تھی۔ فریاد اور التجا تھی۔ ریسکیو والے زخمیوں کو لے جا رہے تھے۔ ایمبولینسز کی بھیانک آوازیں دلوں کو دھڑکا رہی تھیں۔ ہر آواز موت کا پیغام سناتی معلوم ہوتی۔ اور دل اُن لوگوں کے دُکھ سے تڑپنے لگتا جنھیں چند لمحوں بعد اپنے پیارے کی موت کی خبر ملنے والی تھی۔ آنکھ خود بخود ٹپکنے لگی۔ ایک لمحے کو یہ منظر جو نظروں سے اُوجھل ہوا تو نیوز کاسٹر نے ایک بار پھر حملے کے بارے تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا:

''مرنے والوں میں بہت سے پولیس اہلکار اور انٹیلی جنس کے جوان شامل تھے حملے میں زخمی ہونے والوں کو لاہور کے گنگارام اور میو ہسپتال میں داخل کیا گیا ہے۔''

اس قیامت خیز منظر نے اس کی عقل ماؤف کر دی۔ عمارات اس کی نظروں کے سامنے تھیں۔ مگر سمجھ نہ پا رہی تھی کہ آخر یہ کونسی عمارات ہیں۔ حالانکہ وہ بارہا انہیں دیکھ چکی تھی۔ مگر اب اُن کا نقشہ ہی بدل چکا تھا عالی شان عمارات کھنڈر لگ رہی تھیں۔ وہ تو شاید کئی گھنٹے سوچنے کے باوجود

ان کے نام نہ یاد کر پاتی اگر اس کے کانوں میں یہ آواز نہ پڑتی۔

''اس حملے میں ریسکو 15 اور سی، سی، پی، او کے دفتر کا کچھ حصہ زمین بوس ہو گیا۔ پولیس نے دھماکے کے مقام اور گردو پیش سے چھ مشتبہ افراد کو گرفتار کر لیا ہے۔ پولیس ذرائع کے مطابق ریسکو کی بلڈنگ پر اس وقت چالیس جوان ڈیوٹی پہ معمور تھے۔ ریسکو ٹیموں نے موقعہ پر پہنچ کے ریلیف کام شروع کر دیا ہے۔''

وہ یہ سارا منظر دیکھ کر حواس باختہ ہو گی۔ تب صائمہ اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

''ارے آمنہ کہاں ہو؟ سارا گھر چھان مارا مگر تمہاری کوئی خبر نہیں۔ تھک ہار کے تمہارے کمرے کا رُخ کیا...... ارے یہ کیا تم نواب صاحبہ ٹی وی کے سامنے بت بنی بیٹھی ہو اور اُدھر آنٹی بیچاری کام میں اپنی جان ہلکان کر رہی ہیں۔

مگر اسے کچھ سنائی نہ دے رہا تھا۔ اُس نے قریب جا کے اسے جھنجھوڑا۔

''ارے بھائی کہاں کھوئی ہوئی ہو''۔

اس نے آہستہ سے کہا۔

''صائمہ سامنے دیکھو قیامت کا منظر ہے...... یوں لگتا ہے جیسے قیامت آج ہی برپا ہو گئی ہو۔''

صائمہ بھی بے حس و حرکت بیٹھ گی۔ دونوں بُت بنی ہوئیں تھیں۔ فضا میں دھواں ہی دھواں تھا کہیں کسی کا جوتا پڑا تھا تو کہیں کسی کی کیپ۔ کسی کا کٹا ہوا سر دکھائی دیتا تو کسی کا خون آلودہ بازو۔ کہیں کٹی ہوئی ٹانگ تھی تو کہیں دھڑ۔ انسانوں کی آہ و پکار آمنہ کے دل کو پھاڑ رہی تھی۔ انسانوں کے ساتھ ہونے والے اس ظلم پر چرند پرند بھی ماتم کر رہے تھے۔ اس نارواں سلوک پر وہ سراپا احتجاج تھے۔ سڑک پہ پڑے انسانی جسم کے چیتھڑے زندہ انسانوں کو خون کے آنسو رلا رہے تھے۔

''عینی شاھد کے مطابق دھماکے اور فائرنگ کی آواز دور دور تک سنی گئی''۔

ایک بار پھر اس وقت کا منظر پیش کیا گیا تو فائرنگ اور دھماکے کی آواز سے یوں لگا جیسے کسی درندہ صفت دشمن نے رات کے اندھیرے میں حملہ کر دیا ہو۔ ان آوازوں میں کوئی بھی شخص وہ بے رحمی، بے دردی، ظلم و بربریت اور غصے کو محسوس کر سکتا تھا جو بے درد دشمن اپنے دل میں حریف کے لیے رکھتا ہے۔

''لاہور کے تمام ہسپتالوں میں ایمرجنسی نافذ کر دی گئی ہے۔''

انسانی لاشوں کو جو لاشیں کم اور گوشت کے لوتھڑے زیادہ لگ رہے تھے چادروں میں ڈال کر لے جایا جا رہا تھا۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر یوں لگا جیسے کسی قصاب نے جانور کو کاٹا ہو۔ اس کی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں بنائی ہوں۔ اینٹوں کے ڈھیر، چھتوں کے ڈھانچے، دھواں سے آلودہ درخت جلی ہوئی گاڑیاں اور زخمیوں کی آہ و پکار سُن کر یوں محسوس ہونے لگا جیسے یہاں قیامت برپا ہوئی ہے۔ نیوز کاسٹر نے بتایا۔

''اس حملے میں تقریباً 40 گاڑیاں تباہ ہوئیں۔ ہمارے ایک نمائندے کے مطابق دھماکے میں تقریباً 80 سے 90 کلوگرام دھماکہ خیز

مواد استعمال کیا گیا۔"

کہیں موت نظر آ رہی تھی تو کہیں درد سے تڑپتی زندگی۔ پولیس جائے حادثہ سے لوگوں کو دور ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگران کے دلوں میں پائی جانے والی ہمدردی انہیں اپنے مصیبت زدہ بھائیوں کی مدد کو اُکسا رہی تھی۔ وہ آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے مگر بسا اوقات ہم اپنے مظلوم اور دکھی بھائیو کے لیے دُعا کے سوائے کچھ نہیں کر پاتے۔ ہمدردی تو رکھتے ہیں لیکن مدد کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔

وہ دونوں بے سدھ بیٹھی تھیں۔ بولنا چاہ رہی تھیں مگران کے ہونٹوں کو جیسے کسی نے تالا لگا دیا ہو۔ جس کی چابی اب کہیں کھو چکی تھی۔ آہستہ آہستہ انہیں ٹی وی سکرین پہ پھیلا ماتم اس گھر پہ بھی چھاتا ہوا محسوس ہوا۔ آمنہ کا دل گھبرانے لگا اور طبیعت میں بے چینی سی محسوس ہوئی۔ وہ اپنی اس کیفیت کو سمجھ نہ پا رہی تھی۔ وہ اس کا تذکرہ اپنے پہلو میں بیٹھی دوست سے کرنا چا رہی تھی مگر اس کے ہونٹ تو جیسے سل چکے ہوں اُس سے بولا ہی نہ جا رہا تھا۔ ایک دم دل بہت گھبرایا اور وہ اس کی گود میں لیٹ گی۔

"آمنہ کیا ہوا؟...... میں جانتی ہوں اس منظر کو دیکھ کر ہر دل بے چین ہو گیا ہوگا۔ مگر تم تو یوں آن گری ہو جیسے کسی نے تمہاری زندگی ختم کر ڈالی ہو...... یہ تو اب ہمارے ہاں کا معمول بن چکا ہے...... اب تو ہر کوئی عادی ہوتا جا رہا ہے۔"

اس کی کوئی بات بھی اس کے دل کو تسلی نہ دے پائی۔ ہڑ بڑا کے اُٹھی اور بھاگ کر ماں کے پاس آ گئی اور اس سے لپٹ کے کہنے لگی۔

"امی مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے......"

اس کی یہ کیفیت وہ سمجھ نہ پائی۔

"کیا ہوا بیٹی؟ کیوں ڈر لگ رہا ہے؟"

صائمہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔

"آنٹی اس نے دھماکے کی خبر سن لی ہے......"

سکینہ نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"دھماکہ...... مگر کہاں ہوا ہے یہ دھماکہ؟"

آمنہ تو اب بالکل خاموش ہوئی بس ماں سے لپٹے روئے جا رہی تھی۔

"آنٹی جی۔پی۔او چوک کے قریب......"

افسردہ ہو کر کہنے لگی۔

زیادہ نقصان تو نہیں ہوا۔

"آنٹی نقصان تو بہت ہوا جانی بھی اور مالی بھی......"

وہ ذرا آگے بڑھی تو ہاتھ لگنے کی وجہ سے ٹیبل پر پڑا کپ فرش پر گرا اور ٹوٹ گیا۔

سکینہ ایک دم گھبرا گئی۔

"یہ اچھا شگون نہیں...... میرا دل بے چین ہو رہا ہے...... اسد بھی آج صبح کا نکلا ہوا ہے...... میں نے منع بھی کیا مگر کہنے لگا امی ہمارے ملک کے حالات جانے کب ٹھیک ہوں تو کیا اب ہم اس خوف سے گھر پہ بیٹھے رہے کہ باہر نکلیں گے تو مارے جائیں گے...... ویسے بھی آپ پریشان مت ہو چند دنوں میں مَیں اس ملک کو ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ کے لندن جانے والا ہوں...... اللہ میرے بچے کو خیریت سے گھر لانا...... اللہ میرا بچہ تیرے حوالے ہے۔ تو ہی اس کی حفاظت کرنا۔"

صائمہ نے تسلی دیتے ہوئے کہا:

"آنٹی آپ تو خواہ مخواہ فکر مند ہو رہی ہیں انشاء اللہ اسد خیریت سے ہونگے......"

آمنہ جو ماں سے لپٹے روئے جا رہی تھی کہنے لگی۔

"امی مجھے ڈر لگ رہا ہے بھائی خیریت سے ہونگے نا!"

ماں نے بیٹی کو چوما پیار کیا اسے تسلی دی۔ مگر ان کا اپنا دل بھی بے چین تھا۔ اتنے میں دروازے پہ بیل بجی۔ وہ گھبرا سی گئیں۔ سکینہ نے اُٹھنا چاہا مگر صائمہ نے اُسے روک دیا اور خود دروازہ کھولنے چلی آئی۔ وہ ماں بیٹی ڈری سہمی بیٹھی تھیں اُنہیں یوں لگ رہا تھا جیسے ان کی دنیا میں کوئی ہنگامہ برپا ہونے والا ہے۔ سب کچھ لٹنے والا ہے۔ مگر خدا پہ امید رکھے دل کو تسلی دے رہی تھیں کہ سب ٹھیک ہوگا۔ صائمہ نے جب دروازہ کھولا تو اس کے سامنے اسد کا دوست عامر کھڑا تھا۔ اُسے دیکھ کر بولی۔

"عامر بھائی آپ......"

"آنٹی کہاں ہیں؟"

"اندر...... آپ اندر آئیں......"

"میں آتا ہوں......"

وہ گھبرایا ہوا اور پریشان سا لگ رہا تھا مگر اس نے پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ جب وہ کمرے میں آیا تو وہ دونوں ہڑبڑا کے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

اُس نے تعظیمانہ سلام کیا۔

"وعلیکم سلام بیٹا...... تم اکیلے آئے ہو اسد کہاں ہے؟ وہ تو صبح تمہارے ساتھ گیا تھا اُسے کہاں چھوڑ آئے ہو؟"

ایک ہی سانس میں اُنھوں نے کئی سوال پوچھ ڈالے۔ وہ کچھ بھی کہنے سے گھبرا رہا تھا۔ اتنے میں اُن کے کانوں میں ایمبولینس کی آواز پڑی۔ وہ ڈر گئی۔ سائرن آہستہ آہستہ تیز ہو رہا تھا۔

"اسد کہاں ہے؟ میں نے پوچھا اسد کہاں ہے؟"

لڑکھڑاتے لہجے میں بولا۔

"آنٹی اسد گیا تو میرے ہی۔۔۔۔ ساتھ۔۔۔۔ تھا۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔ مجھے کسی کام سے جانا تھا۔۔۔۔ اس لیے وہ خرم کو ساتھ لے گیا۔۔۔۔"

"شکر ہے خدا کا میرا بیٹا بخیریت وعافیت ہے۔۔۔۔"۔ وہ بولی

ایمبولینس کا سائرن تیز ہوتا جارہا تھا اور پھر اُن کے دروازے کے سامنے آکے وہ آواز کہیں ڈوب گئی۔ سب بھاگ کر کمرے سے باہر نکلے۔ دروازے پہ اب دستک ہورہی تھی۔ سکینہ نے گھبرا کے عامر کو دیکھا اُس کی آنکھوں میں ایک سوال تھا۔ وہ آگے بڑھا دروازے کے پاس آیا اور گیٹ کھول دیا۔

"صائمہ بیٹی دیکھو تو یہ عامر گیٹ کھول رہا ہے جیسے کسی گاڑی نے اندر آنا ہو۔۔۔۔ کتنا پاگل ہے نا! جانتا بھی ہے ہمارے پاس کوئی گاڑی نہیں۔"

جوں ہی گیٹ کھلا کچھ لوگ ایک اسٹیچر اُٹھائے اندر داخل ہوئے۔ ماں بیٹی ڈر گئیں۔ ایک دوسرے کو دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو یہ کس کی میت ہے؟ اور اُن کے گھر کیوں لائی جارہی ہے؟ میت صحن میں رکھنے کے بعد وہ پلٹ گئے گیٹ بند ہوگیا۔ دروازے سے انہوں نے خرم کو داخل ہوتے دیکھ لیا تھا اس کے سر پہ پٹی بندھی ہوئی تھی اور وہ لڑکھڑا کر چل رہا تھا۔ اُسے اس حالت میں دیکھ کر وہ تینوں پریشان ہوگئیں۔ لوگ ان کے گھر میں داخل ہورہے تھے مگر اس تمام صورت حال کے باوجود وہ کچھ نہ سمجھ پارہی تھیں۔ سکینہ عامر کے قریب آئی۔

"یہ کیا ہے؟۔۔۔۔ لوگ ہمارے گھر کیوں آرہے ہیں۔۔۔۔؟ تم کچھ بولتے کیوں نہیں ہو؟ اسد کہاں ہے؟

بولو اسد کہاں ہے؟

آمنہ خرم کے پاس گئی اور اُس سے اسی قسم کے سوال پوچھنے لگی۔ صائمہ چپ چاپ بت بنے کھڑی اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ عامر جو کافی دیر سے اپنے آنسوؤں کو روکے ہوئے تھا رو دیا اُسے روتا دیکھ کے وہ اور بھی پریشان ہوگئیں۔ اور اُس سے رونے کا سبب پوچھنے لگیں۔

"آنٹی میں یہ ہی تو بتانے آیا تھا کہ اسد۔۔۔۔"

انھوں نے جلدی سے اس کی بات کاٹ دی۔

"اسد۔۔۔۔ کیا ہوا اسد کو؟۔۔۔۔ کیا بتانے آئے تھے تم؟"

خرم نے نم آنکھوں کے ساتھ اُن کی بات مکمل کی۔

"آنٹی آپ کا اسد۔۔۔۔ ہمارا اسد۔۔۔۔ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔۔۔۔ بم دھماکے کی نذر ہوگیا۔"

اُنھوں نے آگے بڑھ کے ایک زور کا تھپڑ اس کی گال پر رسید کر دیا۔

"کتنے سنگدل ہو تم کہتے ہو میرا دوست مر گیا۔۔۔۔"

عامر نے اُنھیں گلے لگا لیا۔

"آنٹی یہ سچ ہے۔۔۔۔"

وہ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ میت کے پاس آئیں پھر کپکپاتے ہاتھوں سے اس پہ ڈالی چادر کو ہٹایا۔ اُن کے سامنے ان کا نوجوان بیٹا

خاموش لیٹا ہوا تھا۔ بیٹے کو دیکھ کر وہ وہیں بے ہوش ہو گئیں۔ آمنہ جب بھائی کے پاس آئی تو اُسے بے حس و حرکت دیکھ کے زور زور سے چیخیں مارنے لگی۔ روتے روتے وہ بھی نیم بے ہوشی کی حالت میں چلی گئی۔ محلے دار اُن کے گھر اکٹھے ہو رہے تھے۔ ہر ایک کے چہرے پہ دکھ اور غم چھایا ہوا تھا۔ محلے کی عورتوں نے ان ماں بیٹی کو ہوش میں لانے کے لیے کئی تدبیریں کیں۔ جب وہ ہوش میں آئیں تو میت کے پاس بیٹھ کر آنسو بہانے لگیں۔ صائمہ نے آگے بڑھ کے دوست کو گلے لگا لیا۔

"صائمہ بھائی چلا گیا......سب ختم ہو گیا۔"

سکینہ بے سدھ بیٹھی تھی۔ رو رو کے اس کی آنکھوں کا سمندر جیسے خشک ہو گیا تھا۔ سب کے دل دکھی اور آنکھیں پر نم تھیں۔ محلے کی عورتیں آپس میں اس دُکھ کا اظہار کر رہی تھیں۔

"ان ماں بیٹی پر تو قیامت ٹوٹ پڑی ہے......"

"آج تو اس گھر سے ساری خوشیاں ہی اُٹھ گئیں ہیں۔"

"خدا غارت کرے ان کو جو گھروں کے چراغ بجھا دیتے ہیں......سکینہ کی طرح جانے آج کتنے گھروں میں مائیں اپنی کوکھ کے اجڑنے پہ ماتم کر رہی ہوں گی۔ اس بچاری کا تو اسد واحد سہارا تھا۔ اب جو اس کے دن بدلنے کو آئے تو دامن کانٹوں سے بھر گیا۔"

"بہت ہی پیارا......شریف اور لائق بچہ تھا......"

"مگر خدا کے سامنے کس کی چلتی ہے......اس کے فیصلوں کے سامنے انسان کو سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔"

"مگر بہن یہ خدا کی دی ہوئی موت نہیں یہ تو ان ظالموں کا کیا ہوا ظلم ہے جسے وہ جہاد کہتے ہیں کیا یہ ہوتا ہے جہاد۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو......ظلم کو دیکھ کر لگتا ہے یہ لوگ مسلمان ہونگے۔ ہم نے تو یہ ہی سنا ہے ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کی جان مال عزت و آبرو حرام ہوتی ہے۔"

آمنہ صائمہ کے گلے لگ کر رو رہی تھی مگر سکینہ کے آنسو رک گے۔ سب ان ماں بیٹی کو دلاسا دے رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اُنھوں نے بیٹے کی میت سے کپڑا اٹھایا اور اس کا منہ چومنے لگیں۔ پاگلوں کی طرح وہ بیٹے کو چومے جا رہی تھیں۔ اُنھوں نے ایک نظر آسمان پر ڈالی اور ایک سرد آہ بھری۔ اور پھر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئیں۔ ماں کو سوکھے پتے کی طرح زمین پہ گرتے دیکھ کر وہ اس کے قریب آئی۔

"امی......امی اُٹھیں......دیکھیں بھائی ہمیں چھوڑ گیا ہے۔ ہم سے روٹھ گیا ہے۔ اسے منا لو......"

وہ اُس کی کسی بھی بات کا جواب نہ دے رہی تھیں۔ وہ ایک دم گھبرا گئی۔ وہ روتی رہی پکارتی رہی مگر اس کی آواز آہ و پکار کا اُس کی ماں پہ کوئی اثر نہ ہوا وہ اُسی طرح پڑی تھی۔ روتے روتے آمنہ بے ہوش ہو گی۔ اُس پہ بے ہوشی کے دورے وقفے وقفے سے پڑ رہے تھے۔ بھائی اور ماں کی موت نے اُس کی حالت پاگلوں کی سی کر دی۔ جب وہ ہوش میں آئی تو خود کو ہسپتال میں پایا۔ اُس کے ساتھ کیا ہوا؟ کون اُسے یہاں لایا اُسے کچھ یاد نہ تھا۔ بس یاد تھا تو اتنا کہ اُس کا بھائی بم دھماکے میں مارا گیا ہے۔ ہوش میں آ کر اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا تو اپنے پاس عامر کی ماں کو تسبیح کرتے پایا۔

آنکھیں کھولتے ہی اُس کی زبان پر یہ سوال تھا۔

''آنٹی امی کہاں ہیں؟......اسد بھائی......''

بھائی کا نام لیتے ہی اس کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔

''بیٹی بہادر بنو......تمہیں یہ سب جھیلنا ہوگا......کیونکہ ہماری زندگیاں ہمارے غم اور ہماری خوشیاں سبھی اس ذات باری تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ ہمارا کام تو صرف اس کی مرضی کے سامنے سرنگوں ہونا ہے۔''

''مگر آنٹی امی......''

اتنے میں عامر اور خرم اندر داخل ہوئے اُس کو دیکھ کر انہوں نے چہروں پہ مسکراہٹ بکھیر لی اور اس کی خیریت معلوم کی۔ وہ خاموش تھی۔ اپنے بارے کچھ نہ جانتی تھی اُس کو بس ماں کے بارے سوال کرنا تھا اور وہ کیے جارہی تھی۔ عامر نے اس کی توجہ ہٹانے کو جوس کا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔گلاس تو اُس نے پکڑ لیا مگر جوس پینے کی بجائے پاس پڑی میز پہ رکھ دیا۔ وہ بار بار سوال دوہرا رہی تھی اس کے اس سوال کا وہ کیا جواب دے سکتے تھے۔ان کے مرجھائے چہرے اسے بے چین کیے جارہے تھے۔انہوں نے اس کی توجہ ہٹانے کو اِدھر اُدھر کی ہانکنا شروع کر دیں مگر اس کی سوئی تو ایک نقطے پر آ کے اٹک گئی تھی۔ رفعت نے اُسے گلے لگایا۔

''بیٹی تمہاری ماں اب اس دنیا میں نہیں رہی......''

یہ سنناتھا کہ اس کی حالت بگڑ گئی۔ عامر بھاگ کے ڈاکٹر کے پاس گیا۔ڈاکٹر نے اس کا چیک اپ کرنے کے بعد اُسے نیند کا انجکشن لگا دیا۔

''انہیں کوئی بہت بڑا شاک پہنچا ہے......مگر گھبرانے کی کوئی بات نہیں......بس اللہ سے دُعا کریں''......رفعت نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''بھلا ہم اس کے لیے دُعا گو نہ ہونگے مگر ڈاکٹر صاحب اس بچی پہ جو دکھوں کا پہاڑ ٹوٹا ہے وہ کم نہیں......''

''آنٹی دُکھ تو ہماری زندگی کا حصہ ہیں......ہمیں بس خدا سے رحم مانگتے رہنا چاہیے۔''

جب اُسے ہوش آیا تو اس کا چیک اپ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے اُسے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ آمنہ اپنے گھر جانا چاہتی تھی مگر کوئی بھی اُسے وہاں بھیجنے کو تیار نہ تھا۔ سب نے اُسے سمجھایا کہ اُس کا وہاں رہنا مناسب نہیں۔ اگر اس کی ماں زندہ ہوتی تو الگ بات تھی۔ مگر اب وہ تنہا ہے۔ آخر سب کے کہنے پر وہ عامر کے گھر آ گئی۔ وہ اور اس کی ماں اس کا بہت خیال رکھتے مگر وہ یا تو روتی رہتی یا چپ چاپ کسی کونے میں جا کر بیٹھ جاتی۔ نہ کھاتی نہ پیتی۔

وہ اس کا دل بہلانے کی ہر ممکن کوشش کرتے مگر اُس نے تو جیسے چپ رہنے کی قسم کھا رکھی ہو۔ دن بدن اس کی حالت خراب ہونے لگی۔ اُسے ایک بار پھر سے ہسپتال میں داخل کروانا پڑا اور جب وہ گھر آئی تو ڈاکٹر نے اُنہیں مشورہ دیا کہ وہ اُس سے زیادہ سے زیادہ ماضی کی باتیں کریں عامر ہر وقت اسد کا تذکرہ چھیڑے رکھتا۔ اس حادثے کا ذکر کرتا جس نے اُس سے اس کا سب کچھ چھین لیا تھا۔ ڈاکٹرز کا کہنا تھا اگر یہ روئے گی تو شاید جلد اس دُکھ سے باہر نکل پائے گی۔

کبھی وہ عامر کی حرکات پر ہنسنے لگتی اور کبھی رو دیتی۔

''آمنہ میں بالکل اسد ہوں نا!''

''نہیں.....نہیں بھائی آپ اسد نہیں آپ عامر ہیں اسد مت بنیں کیونکہ اسد مر جاتے ہیں۔ میں آپ کو کھونا نہیں چاہتی۔''

دونوں ماں بیٹے نے اُسے چوما، پیار کیا اور دلاسا دیا۔



یہ ایک پہاڑی علاقے کا منظر ہے یہاں حسن چارسوں نظر آتا ہے۔ اونچے اونچے درخت، دور دور تک پھیلا سبزہ، بہتی جھیلیں گرتے آبشار، اونچے اونچے پہاڑ جنت کا منظر پیش کر رہے تھے۔ نہ شہر کی بے ہنگم ٹریفک کا شور، نہ جگہ جگہ پھیلا کوڑا کرکٹ اور نہ ہی آبادی کا سیلاب ہر سو سکون ہی سکون ہے۔ پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں دل کو فرحت بخشتی۔ اس ویران علاقے میں پہاڑوں کے دامن میں ایک ٹوٹا پھوٹا سا کمرہ نظر آ رہا تھا۔ اینٹوں اور گارے سے بنے اس کمرے میں کافی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر پہلے تک یہ خالی تھیں مگر اب فل ہونے لگیں اور پھر چند ہی لمحوں میں سارا کمرہ بھر گیا۔ لوگوں کے آجانے سے اس ویران کمرے میں رونق آ گئی۔ کافی دیر شور رہا اور پھر خاموشی طاری ہوگی۔ سبھی کا لب ولہجہ شکل وصورت مقامی لوگوں سے مختلف ہے۔ وہ خود نہ دکھائی دے رہے تھیں۔ البتہ ان میں چند صورتیں انڈین ہیں۔ کمرے کی سامنے والی دیوار پر دنیا کا نقشہ آویزاں کیا گیا تھا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد سامنے بچھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک شخص اُٹھا ہاتھ میں سٹک پکڑی اور اسے پاکستانی نقشے پر رکھ کر بولا۔

"This is our target"

سب اُس کی جانب متوجہ ہوئے۔

As you know Pakistan is situated in Asia. And it is an important country of th continent. This area where we are is very important for our mission.

اب پاکستانی نقشے سے سٹک کو چین، افغانستان اور ایران کے نقشوں پر باری باری رکھتے ہوئے دوبارہ اپنی گفتگو کا سلسلہ جوڑا۔

"To rule these countries you have to get control over Pakistan."

حاضرین میں سے ایک شخص اُٹھا۔

"But, how Sir?"

اُسے بیٹھنے کا اشارہ دیتے ہوئے بولا۔

"Let me tell you, China is in North, in west there is Afghanistan and Iran. Yo know Pakistan is Sonaka-Cherya."

پچھلی کرسیوں پہ بیٹھے انڈین ایک دوسرے سے کہنے لگے۔

''پاکستان واقعی سونے کی چڑیا ہے۔ اس پہ حکومت کا مطلب سمجھو چین پہ حکومت جو کہ ہمارا بہت بڑا دشمن ہے۔ پاکستان کو مٹانا تو مشن

اول ہے ہی اور اگر چین قبضے میں آ گیا تو واہ! بھائی واہ!............"

دوسرے نے اس کی بات کاٹ دی۔

"یار سنو............"

As you know China is economically Rising as a super power. Which is dangerous. As for as Kazkistan, Uzbakistan, Tajkistan, Tarkumanistan are concerned. They are rich in natural resourses. In west there is Afganistan and Iran Iran is becoming dangerous for us..... Its is a nuclear power."

اب گفتگو کے درمیان تھوڑی دیر کے لیے وقفہ آیا۔ وہ ایک بار پھر آپس میں بات چیت کرنے لگے پاکستان کے جنوب میں بحیرہ عرب واقع ہے جو بحر ہند کا حصہ ہے۔ مغرب اور مشرق کے درمیان تجارت زیادہ تر بحر ہند کے راستے ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک اہم تجارتی شاہراہ پہ ہونے کی وجہ سے پاکستان کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ پاکستان بحیرہ عرب کے راستے خلیج فارس سے ملحقہ مسلم ممالک سے ملا ہوا ہے۔ یہ تمام خلیجی ممالک تیل کی دولت سے مالا مال ہیں۔

دوسرا کہنے لگا۔

"خلیج فارس کی بنا پر بحر ہند ہمیشہ سے بڑی طاقتوں کے درمیان توجہ کا مرکز رہا ہے۔ کراچی پورٹ قاسم اور گوادر ہم سب کیلئے بہت اہم ہیں۔ پھر پاکستان نے بحر ہند کے راستے جو جنوب مشرقی ایشائی ممالک جیسے کہ انڈونیشیا، ملائیشیا، برونائی، دارسلام اور جنوبی ایشیائی مسلم ممالک جیسے کہ بنگلہ دیش، مالدیپ اور سری لنکا سے خوشگوار تعلقات قائم ہیں۔"

ہنستے ہوئے بولا۔

"قائم ہیں نہیں ہوا کرتے تھے۔"

ہنستے ہوئے۔

"Yes, you are night"

دونوں خوب کھلکھلا کر ہنسے، وقفے کے بعد میٹنگ دوبارہ شروع ہوئی۔ پاکستان کی اہمیت اجاگر کرنے کے بعد اب ایک لائحہ عمل تیار کرنے کی ضرورت تھی۔ کسی حد تک کامیابی ثقافتی یلغار سے نصیب ہو چکی تھی۔ باقی ماندہ کامیابی کے لیے منصوبہ بندی کی ضرورت تھی۔ وہ یہ تو جانتے تھے کہ کسی بھی ملک پہ حکومت کرنے اور اس کا کنٹرول حاصل کرنے کے لیے بدنظمی واحد راستہ ہوتی ہے اور بدنظمی کو پھیلانے کے لیے آپس کی لڑائی مگر وہ اس حقیقت سے بھی اچھی طرح واقف تھے کہ مسلمان کو مسلمان کے خلاف کرنا آسان نہیں۔ کئی سالوں کی سوچ و بچار کے بعد آخر انہوں نے ایک راہ تلاش کر لی تھی۔ اس سے سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے گی۔ وہ ایک سرد جنگ چھیڑ رہے تھے یہ ایسی جنگ ہے جو دیمک کی طرح اندر ہی اندر قوموں کو چاٹ لیتی ہے۔ یہاں موجود لوگوں کو اس کے بارے بتاتے ہوئے کہا۔

"Pakistan will help us. Muslim will fight against muslim. Patan will fight for us in the name of Islam.......... These foolish always keep ready to fight we will tell them that Islam needs their lives.

حاضرین میں سے ایک نے سوال کیا:

They will not be ready if we teach.

ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"They will be ...... they fight for us But we need such people who know little about Islam. Those who think a true muslim is a man who offers prayer, wears beard. Whatever he says is right."

ایک بولا۔

"Then Patan are the best"

مسکرا کر بولا۔

"Yes"

دوسرے نے سوال کیا۔

"But sir if we study Islam we may embrace it."

"No, no my dear, we will give you that books in which there is little knowledge..... do you understand?

سب نے یک زبان ہوکر جواب دیا۔

"Yes, Sir, we understand..."



انہی پہاڑوں کے دامن میں چھوٹے چھوٹے قصبے ہیں جہاں غریب غربا کے جھونپڑے نظر آ رہے ہیں یہاں بھی مزدور طبقہ آباد ہے۔ وہ محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتے ہیں۔ انہی جھونپڑوں میں سے ایک شیر گل کا جھونپڑا ہے جس میں وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔ دن بھر محنت مزدوری کے بعد جب شام کو وہ گھر لوٹا تو اندر قدم رکھتے ہی بچے اس کے ساتھ لپٹ گئے۔ اس کی بیوی چولہے کے سامنے بیٹھی کھانا پکا رہی ہے۔ اُسے دیکھ کر اُٹھی اور اُسے پانی پینے کو دیا۔ کھانا کھا کر جب بچے سو چکے تو بیوی سے کہتا ہے۔

''سنبل ہم تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہے............''

آج تک کبھی ایسا موقعہ نہ آیا تھا جب اُس نے بیوی سے کوئی مشورہ مانگا ہو آج اچانک اتنی بڑی تبدیلی پہ وہ حیران ہوگئی۔

''ہمارا علاقہ سے دور ایک مدرسہ بنا ہے...... ہمارا علاقہ کے ایک آدمی کو وہاں نوکری مل گیا ہے۔''

''اچھا............''

وہاں............

''مگر کسے............''

''امجد کو...... امجد جس نے قرآن پاک کا علم حاصل کیا تھا۔''

نوکری کا بتانے کے بعد اُس نے مدرسے میں بچوں کی دینی و دینوی تعلیم کا تذکرہ بھی کیا۔ اُسے بتایا کہ وہاں پڑھنے والے بچوں کو وہ لوگ خود کھانے پینے کو دیتے ہیں۔ وہ شوہر کی باتوں سے جان گئی تھی کہ اس کا کیا مطلب ہوسکتا ہے۔ اُس نے بار بار اُس سے ان سب سہولیات کا تذکرہ کیا مگر وہ کسی بھی بات سے قائل نہ ہوئی۔ بچوں کو خود سے دور کرنا اُسے اپنے بس کی بات نہ لگتی تھی۔ کئی روز گزر گئے ہر روز جب بھی وہ گھر لوٹتا بیوی سے اسی بات کا ذکر چھیڑ دیتا۔ مگر اس کا یہی جواب ہوتا۔''

''ہم یہ نہیں کرسکتا...... اپنا بچہ کو خود سے دور...... نہیں...... یہ ہمارا بس کا بات نہیں......''

آخر اس کے بار بار انکار پہ وہ بھی خاموش ہوگیا۔ جو وہ محنت مزدوری کر کے لاتا اُس میں وہ گزارا کرتی مگر غریبوں نے روزے رکھے دن لیے آئے والا حساب ہوا جو محنت مزدوری اُس کو ملتی تھی وہ ختم ہوگئی۔ ہر روز خالی لوٹنے لگا اور گھر کے حالات ابتر ہونے لگے تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔ شیر گل اُسے اس کا ذمہ دار ٹھہراتا اس کا خیال تھا چونکہ اس نے بچوں کو دینی تعلیم سے روک دیا ہے اس لیے اللہ اُن سے ناراض ہوگیا ہے۔ کبھی گھر کے حالات کو دیکھتی کبھی بچوں کی جدائی کا اور کبھی شوہر کے طعنے وہ ان سب سوچوں میں اُلجھ کر رہ گئی تھی۔ آخر کار اس تصادم میں ہار اُس کو ہی ماننا پڑی۔ اور اُس نے سر جھکا دیا حالات کے سامنے شوہر کے سامنے۔

اِدھر حالات کے ستائے ہوئے عبداللہ نے بھی مدرسے کا ہی رُخ کیا۔ جب وہ مدرسے پہنچا تو وہ اُسے ایک حجرے میں لے گئے۔ یہاں لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ دم و درود کرانے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ لوگ دور دور سے آئے ہوئے تھے۔ ہر کوئی اپنی مشکل بتاتا قاری صاحب سے دم کرواتا اور چل دیتا اگر کوئی کچھ نذرانہ دینے کی کوشش کرتا تو اُسے ڈانٹا دیا جاتا۔ اس کا نذرانہ اُسے واپس دے دیا جاتا اس منظر نے تو عبداللہ کی نظر میں اس شخص کی قدر و منزلت بڑھا دی۔ کافی دیر یہ منظر اُس کی آنکھوں کے سامنے چلتا رہا اور جب سب جا چکے اور اُسے خلوت نصیب ہوئی تو اُس نے اپنے آنے کا مقصد بیان کرنے کو زبان کھولی مگر اُسے یہ کہہ کہ چپ کروا دیا گیا کہ فی الحال قاری صاحب دُعا فرمائیں گے لہٰذا تھوڑی دیر کو وہ خاموش ہوجائے۔ چنانچہ اُسے ایک بار پھر بولنے سے محروم کر دیا گیا۔ تھوڑی دیر یوں ہی گزری اور آخر کار اُسے بولنے کی سعادت بخشی گئی۔

''تم کیسے تشریف لائے ہو؟''

یہ شیریں لب ولہجہ اُسے بہت بھایا اور وہ دل ہی دل میں اُس کے گن گانے لگا اور فیصلہ بھی کر لیا کہ وہ ایسے ہی شخص کی نگرانی میں اپنے بچوں کو تعلیم دلوائے گا۔ وہ غریب تھا اس لیے اسے آٹھ بچوں کا پیٹ پالنا مشکل ہو رہا تھا اور بیوی کے بیمار ہو جانے کی وجہ سے تو اس پہ اور مشکل آن پڑی تھی۔

''تم کیا سوچتے ہو......؟''

''جی کچھ نہیں......میرا نام عبداللہ ہے۔''

''عبداللہ ہم کو تم سے کوئی لالچ نہیں......ہم تو یہاں اللہ اور اس کا رسول ﷺ کے دین کا خدمت کے لیے بیٹھا ہے۔ ہم تو یہ چاہتا ہے کہ اسلام کا تعلیم عام ہو......تم اپنا بچہ یہاں لے آؤ ہم اُس کا ہر طرح سے خیال رکھے گا۔ اُسے یہاں محبت ملے گا گھر جیسا ماحول ملے گا......''

عبداللہ نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

''آپ جیسے مناسب سمجھے اُنہیں رکھے......''

''روٹی کپڑا کی تم فکر مت کرنا......''

اُسے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی بیوی کی علالت نے اُسے بہت پریشان کر دیا تھا مگر یہاں آ کر اُسے لگا اُس کی پریشانیاں دور ہو گئیں ہیں۔ مشکلیں ٹل گئیں ہیں۔ وہ دل ہی دل میں رب تعالیٰ کا شکر ادا کر رہا تھا اس کے رازق ہونے پہ اس کا ایمان پختہ ہو گیا۔

''اگر آپ کہے گا تو ہم اور ہمارا بیوی آپ کی خدمت کرے گا......آپ دین کا خدمت کر رہا ہے اگر ہم آپ کا خدمت کرے گا تو شاید آپ کے صدقے اللہ ہمارے گناہ بخش دے......اللہ اپنے نیک بندوں کے وسیلے بُروں کی غلطیاں معاف کر دیتا ہے۔''

''تم کیا بات کرتا ہے......ہم بھی تم جیسا ہے......''

''یہ تو آپ کا اچھا پن ہے............''

''تم کل اپنا بچہ لے آنا......''

اُس نے آگے بڑھ کر قاری صاحب کے ہاتھوں کو چوما اور پھر سلام کر کے وہاں سے رخصت ہو گیا۔



تنگ و تاریک راستوں سے گزرتے ہوئے گل خان اور سیف الرحمٰن ایک ویران سے مقام پہ پہنچے یہاں دور دور تک کوئی بشر دکھائی نہ دیتا تھا۔ چرند پرند بھی فضا میں اُڑتے نظر نہ آ رہے تھے یوں لگتا تھا جیسے یہاں انسانوں کے ساتھ ساتھ ان کا داخلہ بھی ممنوع ہے۔ اب وہ ایک غار میں پہنچے غار تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا بس ایک دیا مدھم سی روشنی پھیلائے ہوئے تھا۔ یہاں آ کر وہ خاموش ہاتھ باندھے کھڑے ہو گئے۔ ایک ساعت کے بعد اُنہیں ایک آواز سنائی دی۔

''کام ہو گیا......''

''ہو گیا......'' گل خان بولا

''تم جاؤ......''

''کمانڈر ہم اسلحہ کے واسطے آیا ہے'' سیف الرحمٰن نے کہا۔

''اس کا تم فکر مت کرو......تمہارے پہنچنے سے پہلے پہنچ جائے گا......''

''خدا حافظ......'' اُن دونوں نے کہا۔

''خدا حافظ......''

اب وہ دونوں اسی خاموشی سے وہاں سے باہر آ گئے جس خاموشی سے وہ وہاں داخل ہوئے تھے۔ انہی راستوں پر چلتے ہوئے وہ ایک نئے مقام پر پہنچے۔ یہ ایک ڈیرہ تھا اس کا رقبہ اچھا خاصا تھا یہاں بہت سے لوگ موجود تھے۔ سب کے حلیے ایک سے تھے سب نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور ان کے چہروں پہ ہلکی ہلکی سی داڑھیاں تھیں۔ ان دونوں کی آمد پہ ساروں نے اُنہیں سلام کیا۔ جس کا انہوں نے بڑے پرتپاک انداز میں جواب دیا۔ ان لوگوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے وہ ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں پہنچے اس کمرے میں چار پائیاں بچھی ہوئیں تھیں جن پہ کچھ بچے لیٹے سستا رہے تھے اور کچھ کھیل رہے تھے۔ ان سب کی عمریں چودہ پندرہ سال کے لگ بھگ تھیں وہ باری باری ان کے پاس گئے اور ان کا حال احوال پوچھا۔ کچھ خوش وخرم دکھائی دیتے تھے تو کچھ اداس اور خاموش۔ کچھ چہرے اُداس تھے تو کچھ کھلے ہوئے مگر انہوں نے ان کی اُداسی کو کوئی توجہ نہ دی۔

''اب ہم تم کو ایک نئی جگہ پہ لے جائے گا وہاں تم کو بہادر بننا سکھایا جائے گا۔ تا کہ تم مرد کا بچہ بن سکے......تم چلے گا نا! اب تم کو دین کا خدمت کرنا ہوگا۔''

ان بچوں کو یہاں آئے کچھ ہی دن بیتے تھے اور ان دنوں میں ہر روز ان سے اسی قسم کی باتیں کی جاتی تھیں۔ اب وہ یہاں سے ایک دوسرے کمرے میں آئے یہاں بھی کچھ بچے موجود تھے۔ مگر سب کے سب رو رہے تھے۔ ان کی زبانوں پہ گھر جانے کی رَٹ تھی یا ماں سے ملنے کی خواہش جس کا وہ بار بار اظہار کر رہے تھے۔ کچھ دیر وہ دونوں دور کھڑے ان سب کا جائزہ لیتے رہے۔ بچوں کی حالت قیدی پرندے کی سی تھی۔ اُن سب نے رو رو کے خود کو ہلکان کر لیا تھا۔ اب تو ان کے آنسو بھی تھم چکے تھے۔ حلق بھی خشک ہو چکے تھے۔ یہ ننھے پھول مرجھا گئے تھے ڈر خوف نے اُنہیں اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔

بچوں کی حالت دیکھتے ہوئے انہوں نے اُنہیں چپ کروانے کی کوشش کی حتیٰ کہ انہوں نے انہیں ڈانٹ بھی دیا۔ اس ڈانٹ ڈپٹ کے باوجود چند بچے رو رہے تھے۔ وہ دونوں ان کے قریب گئے اُنہیں پیار کیا اور تسلی بھی دی اُنہیں سمجھایا کہ وہ انہیں صرف چند دن یہاں رکھیں گے اور اس کے بعد اُنہیں ان کے والدین کے پاس چھوڑ آئیں گے۔ مگر اُنہیں ان کی بات پہ یقین ہوتا تو وہ چپ ہوتے۔ اب اُن کی آوازوں میں تلخی پیدا ہوگئی۔ ان کے سرد اور روکھے پن نے بچوں میں دہشت پیدا کر دی کچھ کمی تلخ لہجے نے پوری کر دی۔ سب ڈر خوف سے سہم گئے۔ ایک بچے کی حالت بگڑنے لگی۔ وہ زمین پہ لیٹ گیا وہ دوڑتے ہوئے اس کے پاس آئے۔ کچھ دیر وہ ہاتھ پیر مارتا رہا اور پھر ہمیشہ کے لیے اس جہان فانی سے کوچ کر گیا۔

وہ اُسے وہی چھوڑ کر کمرے سے باہر آ گئے اور پہرے دار کو اس کے کفن دفن کا انتظام کرنے کے علاوہ بچوں کو ہال میں منتقل کرنے اور ان

کے کھانے پینے کا بھی کہا۔ وہ جلد از جلد انہیں ہال میں منتقل کرنا چاہ رہے تھے۔ آج وہ ہال میں موجود بچوں کو نئے مقام پر لے جا رہے تھے جہاں ان کی جسمانی تربیت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس تربیت کے بعد انہیں مشن پہ روانہ کیا جانا تھا۔ جب وہ کمرے سے باہر جانے لگے تو ان کے چہروں پہ نہ تو ننھے بچے کے مرنے کا دُکھ تھا اور نہ بچوں کے آنسوان کے دلوں میں رحم پیدا کر سکے تھے انہیں تو ملال صرف اس بات کا تھا کہ ان کی محنت ضائع گئی۔ بچہ ان کے لیے کچھ کیے بغیر مر گیا۔ وہ اس بات پہ افسوس کر رہے تھے کہ وہ کتنی مشکل سے انہیں پکڑ کر لاتے ہیں اور وہ کتنی آسانی سے مر جاتے ہیں۔ پہرے دار نے مردہ بچے کی لاش اُٹھائی اور باہر لا کر ایک دوسرے شخص کے حوالے کر دی۔ اور اُسے اس کے کفن دفن کا کہہ دیا۔ اور خود بچوں کے لیے کچھ کھانے کو لینے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ان کے لیے کھانے کو لے آیا۔ بچے کھانے پر چیلوں کی طرح جھپٹ پڑے۔ اُنہیں کچھ کھائے چوبیس گھنٹے ہو چکے تھے اور اب تو ان کے پیٹ بھی اندر دھنس گئے تھے۔ کھانا سامنے پا کر اس پہ ٹوٹ پڑے۔ یہاں روز ہی اس قسم کا منظر دیکھنے کو ملتا تھا۔ والدین سے ان کے جگر گوشوں کو چھین کر یہاں لایا جاتا۔ چند روز گزر جانے کے بعد اُنہیں ایک نئے مقام جسے یہ ٹریننگ سنٹر کے نام سے موسوم کرتے ہیں لے جایا جاتا۔ جسمانی تربیت کے بعد وہ خود کو موت کی آغوش میں دے دیتے۔ نہ صرف اپنی زندگیوں کو تباہ کرتے بلکہ اپنے جیسے کئی دوسرے انسانوں کو بھی موت کی گھاٹ اُتار دیتے۔ گھروں میں سوگ برپا کر دیتے۔ ہزاروں انسان اب تک اندھیر نگری میں جا چکے تھے۔ پچھلے چند سالوں سے یہ سلسلہ جاری تھا اور اب تک جاری ہے۔



آمنہ دیوار پر لگے کلاک پہ نظریں گاڑے ہوئے ہے۔ ہر ٹک ٹک اس کے اندر ایک ہل چل سی پیدا کر دیتی ہے۔ جوں جوں سوئیاں آگے

کو چلتی ہیں وہ بھی خود کو یہاں سے دور پانے لگتی ہے۔ پھر جیسے ہی کلاک پرٹن کے ساتھ 2 بجے اُس کے کانوں میں آواز گونج اُٹھی۔

''آمنہ...... آمنہ...... جلدی سے آؤ......''

وہ ناول میں اس قدر کھوئی ہوئی تھی کہ ان ساری آوازوں کو سُنی اَن سُنی کر رہی تھی۔ مگر اسد اُسے مسلسل پکار رہا تھا۔ ناول میں دلچسپ موڑ آچکا تھا اُٹھنے کو اُس کا بالکل بھی جی نہ چاہ رہا تھا۔ مگر اُسے اُٹھنا پڑا کیونکہ اب اُسے ماں کی ڈانٹ بھی سنائی دینے لگی۔ غصے سے ناول وہی رکھا اور کمپیوٹر روم میں آ گی۔ اسد کمپیوٹر پر اسائن منٹ بنانے میں مصروف تھا۔ آنکھیں تو کمپیوٹر پہ تھیں مگر زبان اُسے ستانے میں لگی ہوئی تھی۔ اُس کے پاس آ کر بڑے پیار سے بولی 'جی بھائی' مگر گانوں کے شور میں اس کی آواز دب گئی۔ جب دیکھا کہ اُسے سنائی نہیں دیا تو ذرا اور اونچا بولی۔ وہ اُس کی آوز تو سن رہا تھا مگر جان بوجھ کے انجان بن گیا۔ اب بھی وہ اُسے مسلسل بلا رہا تھا۔ پہلے تو وہ بے چاری یہ ہی سمجھتی رہی کہ اُسے سنائی نہیں دے رہا مگر پھر اُسے اندازہ ہو گیا کہ وہ اُسے ستانے کے لیے یہ ڈرامہ کر رہا ہے۔ اِدھر ماں اُسے مسلسل ڈانٹ رہی تھی۔

''بھائی کی بات سنو۔ بیچارا کب سے بلا رہا ہے؟''

اب تو اُسے خوب غصہ آ گیا۔ اُس نے بھی اپنے ساتھ ہونے والے سلوک کا بدلہ لینے کا سوچا اور کمپیوٹر کی طرف بڑھی۔ سوئچ آف کرنے کو ہاتھ بڑھایا تو وہ جھٹ سے بولا۔

''ارے...... ارے یہ کیا کر رہی ہو؟ میرے کیے کرائے پہ پانی تو نہ پھیرو۔ بڑی مشکل سے میں نے یہ اسائمنٹ بنائی ہے۔''

وہ بھی جھٹ سے بولی!

''واہ بھائی واہ! اپنی باری آئی تو کیسے تڑپ اُٹھے ہو...... اور مجھ بیچاری کو جو کب سے ستا رہے تھے اُس کا کوئی احساس ہی نہیں...... آج اپنی محنت کو رائیگاں ہوتا دیکھیں گے تو آئندہ کے لیے کان پکڑ لیں گے......''

''میری پیاری بہن ایسا غضب مت کرنا...... تم آئندہ کا کہتی ہو میں آج ہی کان پکڑ لیتا ہوں...... اُس نے کان پکڑ لیے۔ مگر وہ ماننے کو تیار نہ تھی۔ اُس کی ضد تھی کہ وہ آج اُسے سبق سکھا کر رہے گی تا کہ آئندہ وہ اُسے تنگ کرنے یا ستانے کی جرأت نہ کر سکے۔ مگر وہ اُسے ستانے سے کب باز آنے والا تھا۔ کبھی اپنے کانوں کو پکڑ کر معافی مانگتا تو کبھی اُس کے کان پکڑ کر۔ اب اُسے بھائی پہ غصہ آنے کی بجائے پیار آنے لگا اور اس کی ان حرکتوں پر ہنسنے لگی۔

ہنستے ہنستے وہ ایک دم سے رونے لگی خود کو اکیلے دیکھ کر وہ جان گئی کہ حقیقت وہ نہیں یہ ہے جس میں وہ بالکل تنہا ہے۔ نہ بھائی پاس ہے اور نہ ماں۔ رفعت جو کافی دیر سے اس کے دروازے پر کھڑی اُس کے رونے اور ہنسنے کا منظر دیکھ رہی تھی جان گئی کہ اس آنکھ مچولی کے پیچھے کیا ہے۔ آگے بڑھ کر اُسے گلے لگایا۔ اُسے پھر سے خوش کرنے کو پوچھنے لگی۔

''آخر ہمیں بھی تو پتہ چلے ہماری بیٹی کیوں مسکرا رہی تھی؟''

اُس کا پوچھنا تھا کہ وہ ہنسنے کی بجائے رونے لگی اور پھر خود ہی اُسے سب بتانے لگی۔ اُس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''آخر شرارتی نے تمہیں بلوایا کیوں تھا؟''

وہ بھی مسکرا دی۔

''چائے لانے کے لیے...... میں نے کہا بھی بھائی اس وقت کھانا کھایا جاتا ہے...... بھائی نے میرے ساتھ بہت بحث کی...... مگر جیت میری ہی ہوئی...... بھائی تو پاگل تھے میں تھوڑی۔ وہ تو خود کو چائے پلا پلا کر مارنے پہ تلے ہوئے تھے مگر میں بھلا ایسا کیوں ہونے دیتی۔''

''تم عامر کے ساتھ بھی یوں ہی لڑا کرو۔ ضد کیا کرو...... آخر وہ بھی تو تمہارے بھائی جیسا ہے......''

وہ پھر سے رو دی۔

''وہ تو ٹھیک ہے مگر آنٹی اسد بھائی کوئی دوسرا کیسے ہو سکتا ہے۔'' ☆

☆

کالج میں اب وہ پہلے جیسی گہما گہمی شور شرابا، ہلہ گلا، شرارتیں، قہقہے اور رونقیں نہ رہی تھیں۔ ہر طالب علم اُداس اور بجھا بجھا سا دکھائی دیتا تھا۔ پڑھائی میں دلچسپی صفر ہوتی جا رہی تھی۔ اساتذہ اُن کے اس رویے سے کافی پریشان اور فکر مند ہیں۔ وہ انہیں سمجھاتے تسلی دیتے اور اچھے مستقبل کی امید دلواتے مگر اُداسیوں نے یہاں کا رُخ کر لیا تھا۔ اُن کے چہرے مرجھا چکے تھے۔ یوں لگتا جیسے کسی نے ان کی ہنسی چھین لی ہو۔ ملکی حالات نے یہاں سب کو خوفزدہ کر دیا تھا۔

جس کی وجہ سے تعلیمی سرگرمیاں ماند پڑ رہی تھیں غیر حاضریاں بڑھ رہی تھیں۔ کینٹین اجڑی اجڑی تھی۔ سب کے دلوں میں یہ خواہش تھی کہ ملک کے حالات بہتر ہو۔ حملوں کا زور کم ہو۔ موت اپنے پر سکیڑ لے۔ زندگی کی تتلی پھر سے باغ میں اُڑنے لگے۔ لوگ جو ہنسنا بھول چکے ہیں پھر سے مسکراہٹیں ان کے چہروں پر پھیل جائیں۔ کالجز کی گہما گہمی لوٹ آئے۔ گلیاں کوچے پھر سے آباد ہو۔ ڈر خوف پر لگا کے اُڑ جائے۔ مگر انہیں یہ سب ہوتا نظر نہ آ رہا تھا۔ بلکہ دن بدن خوف بڑھتا جا رہا تھا۔ اُداسیاں پھیلتی جا رہی تھیں۔ موت ایسے ہی پھیل رہی تھی اور زندگی کی تتلی آگ میں جل رہی تھی۔ سب کی زبانوں پہ یہ ہی الفاظ تھے۔

''اللہ اس ملک کی حفاظت کرے۔ ان حالات میں ملکی سلامتی نظر نہیں آتی۔''

ملکی سلامتی نے ذہنوں کو پریشان کر رکھا تھا۔ کالجز میں طلباء کتابیں سامنے رکھے صرف اسی موضوع پہ باتیں کرتے دکھائی دیتے۔ بار بار کے خودکش حملوں نے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین لی تھی۔ وہ مفلوج ہو چکے تھے۔ اب اُنہیں نہ پڑھائی کی فکر تھی اور نہ امتحانات کا ڈر۔ اگر فکر تھی تو زندگی کی۔ ڈر تھا تو موت کا۔ ہر ایک کو سکون کی تلاش تھی۔ وہ سکون جو ماضی کی ایک یاد بن کر رہ گیا تھا۔ جو روٹھ گیا تھا۔ اساتذہ اکرام جانتے تھے ملکی صورت حال نے طلباء کو بہت پریشان کر رکھا ہے وہ ان کی ہمت بندھاتے۔ وہ ان باتوں سے کسی حد تک مطمئن تو ہو جاتے مگر ہر نیا دن ان کے حوصلوں کو پست کرتا جا رہا تھا۔ ہر جگہ حوصلہ کرو ہمت سے کام لو جیسے الفاظ سننے کو ملتے۔ ہر کوئی امن چاہتا تھا۔ جہاں دیکھو ٹولیوں کی ٹولیاں امن کے بارے محوِ گفتگو نظر آتیں۔

آصف اپنے دوستوں کو ایک جگہ اکٹھا دیکھ کر اُن کے پاس چلا آیا اور ان کا حال احوال پوچھا مگر ان کے پاس وہی پرانا جواب تھا۔

''ہمارا حال کیا پوچھتے ہو۔ فضا میں پھیلی اُداسی کے بعد یہ پوچھنے کا تُک تو نہیں بنتا تھا مگر لگتا ہے تم ہمارے منہ سے ہی سننا چاہو گے کہ ہم اُداس اور فکر مند ہیں۔ اجمل نے کہا۔

آصف نے کہا'' فکر مند کیوں ہو انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہمارے ملک میں بہت جلد امن و امان ہو گا۔ خوشیاں رونقیں............''

''مگر کیسے اور کب؟'' کاشف نے سوال کر ڈالا۔

آصف نے جواب دیا۔'' اس کا فیصلہ وقت کرے گا اور وہ وقت جلد آنے والا ہے۔ بس ہمارا کام دُعا کرنا یا دل لگا کر پڑھائی کرنا ہے۔ اسی صورت میں ہم کامیاب ہونگے۔''

اجمل نے روکھے سے انداز میں کہا۔'' اب تم بھی نصیحت کرنے لگے۔ اوروں کو نصیحت خود میاں فصیحت......''

کاشف نے کہا'' یار آصف کہتا تو ٹھیک ہی ہے............''

وہ پھر سے بولا۔'' مگر اس کے لیے ذہنی سکون بہت ضروری ہے۔ جب حواس پہ خوف چھایا ہوا ہو تو یہ کام مشکل ہوتا ہے۔''

آصف نے بے فکری کے عالم میں کہا۔'' ذہنی سکون کی تو تم فکر ہی نہ کرو میں نے اسے تلاش کر لیا ہے......بس تم تیار ہو جاؤ......''

آصف نے اُنہیں اپنے ایک محلے دار کے بارے بتایا جو کچھ عرصہ قبل ہی ان کے محلے میں آباد ہوا تھا۔ مولانا صاحب نے اپنے حسن اخلاق سے پورے محلے کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ وہ شروع شروع میں انہیں شک کی نگاہ سے دیکھتا رہا کیونکہ مولانہ ٹائپ کے لوگ ہمیشہ فساد برپا کرنے والے پائے گے ہیں۔ مگر اُن کی باتیں تو دلوں کو جوڑنے والی تھیں۔ فرقہ واریت پہ انہوں نے کبھی بات ہی نہ کی۔ بس سب کو حسن اخلاق، نیکی اور بھلائی کا درس دیتے رہے۔ آخر وہ اپنے رویے پہ شرمندہ ہوا اُس نے خواہ مخواہ ایک نفیس انسان کے بارے ایسا گمان کیا۔ اب وہ باقاعدہ ان کے پاس جانے لگا تھا۔ اور اب دوستوں کو بھی ان کے پاس لے جانا چاہ رہا تھا۔ وہ بھی اس کی طرح شک کر رہے تھے۔ کئی روز وہ انہیں اپنے ساتھ چلنے کا کہتا رہا مگر وہ تو ایسی محفلوں سے دور بھاگتے تھے۔ مذہب کے نام پہ ملک میں جو خانہ جنگی جاری تھی اس نے ان کے اس رویے کو جنم دیا تھا۔ کئی دن تو وہ آج نہیں کل، کل نہیں پرسوں کہہ کر اُسے ٹالتے رہے۔ مگر ایک روز وہ اُس سے ملنے اس کے گھر آئے تو باتوں باتوں میں مولانہ صاحب کا تذکرہ چھڑ گیا۔ اب تو وہ انہیں اپنے ساتھ لے چلنے پہ بضد تھا۔ مگر سب کے سب پہلے تو حامی بھرتے رہے مگر پھر آنکھ بچا کر اُس کے گھر سے نکل آئے۔ مگر اس نے بھی تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ اُنہیں اپنے ساتھ ضرور لے کر جائے گا۔

☆

عبداللہ اپنے پانچ بچوں کو لیے مدرسے پہنچ گیا۔ وہ ہال میں بیٹھے قاری صاحب کا انتظار کر رہے تھے اپنے بچوں کو بار بار سمجھا رہا تھا کہ اُنہیں یہاں بہت محنت سے پڑھنا چاہیے تا کہ وہ دین کے بارے جان سکے۔ اُس نے انہیں اچھے کھانے کا لالچ دے رکھا تھا اور سب خوشی خوشی اُس کے ساتھ یہاں آنے کو تیار ہوئے تھے کہ وہ یہاں اچھا کھانا کھا سکیں گے۔

وہ بچوں کے ساتھ بات چیت میں محو تھا کہ اُسے اطلاع ملی کہ قاری صاحب تشریف لا رہے ہیں وہ جلدی سے خاموش ہو گیا اور اُنہیں بھی خاموش رہنے کی تاکید کی۔ جوں ہی وہ تشریف لائے اُس نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ چوما اور سلام پیش کیا۔ پھر اشارہ پا کر بیٹھ گیا۔

"یہ ہمارا بچہ ہے......"☆

قاری صاحب نے اپنے ایک شاگرد کو بلوایا اور بچوں کو ساتھ لے جانے کا کہا۔ جب وہ اُنہیں لے جانے کو آگے بڑھا تو وہ تھوڑے سے گھبرائے ایک نے تو رونا شروع کر دیا مگر جب باپ کی آنکھوں میں غصہ دیکھا تو چپ چاپ اس کے ساتھ چلے آئے۔ اب اُسے جانے کا کہہ دیا گیا۔ مگر جانے سے قبل اُس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"ہم کبھی کبھی اپنا بچہ سے مل سکتا ہے......"

انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔

"ضرور......مگر شروع شروع میں......بعد میں ملنے کا اجازت نہیں ہوگا............"

اُسے پریشان دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ وہ اپنے فیصلے پہ پچھتا رہا ہے۔

"تم فکرمند کیوں ہوتا ہے......ہم ان کا بہت خیال رکھے گا۔ اگر ہم روز روز اُنہیں تمہارے ساتھ ملنے کا اجازت دے گا تو پھر اس کا پڑھائی میں دل نہیں لگے گا......اچھا......اچھا......اب زیادہ پریشان مت ہو مل لیا کرنا......اب اُسے اطمینان ہو گیا اور اس نے جانے کی اجازت مانگی۔

☆

وہ بھائی کے ہاتھ سے کان کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی مگر گرفت بہت مضبوط تھی۔ اُس نے ماں کو بلایا تاکہ وہ اس کی مدد کر سکے۔ غلطی اُس کی ہی تھی اُس نے جان بوجھ کر اس کی کتاب چھپا دی تھی اور وہ بیچارا سارا دن کالج میں پریشان رہا یہ اس کی بہت اہم کتاب تھی اس لیے تو اس کے کھو جانے کا سوچ کر سارا دن فکرمند ہوتا اور گھر آ کر جو اُس سے کتاب کے بارے پوچھا تو اُس نے صاف انکار کر دیا مگر اُس کی ہنسی نے اُسے شرارت کی اطلاع دے دی۔ تبھی تو وہ اس کا کان پکڑے ہوئے تھا تاکہ وہ تھک ہار کر بتا دے۔ مگر وہ بھی فی الحال تنگ کرنے کے موڈ میں تھی اس لیے مسلسل انکار پہ انکار کیے جا رہی تھی۔

"چڑیل سیدھی طرح بتاؤ گی یا نہیں......"

چڑیل لفظ سننا تھا کہ آگ بگولہ ہو گئی۔

"اب تو ہرگز نہیں بتاؤں گی کہ کتاب کہاں رکھی ہے......میں جانتی ہوں کہ اُس میں کیا خاص بات ہے......"

اُس نے غصے میں اتنا بتا دیا تھا کہ اُسی نے یہ شرارت کی ہے۔

"اب تو میں ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔"

اتنے میں سکینہ ان کے پاس آن پہنچی ماں کی آواز سن کر اس کی توجہ تھوڑی سے ہٹی جس سے گرفت ڈھیلی ہو گئی اُس نے جلدی سے کان

چھڑایا اور بھاگ گئی۔

''نہیں بتاؤں گی.....نہیں بتاؤں گی.....''

اسد اس کے پیچھے بھاگا۔''ٹھہرو چڑیل.....''

سکینہ ان دونوں بہن بھائیوں کی نوک جھونک اور لڑائی جھگڑے سے جہاں تنگ آ چکی تھی وہاں ان کی محبت کے اس انداز پہ ہنس بھی دیا کرتی۔ وہ اب بھی انہیں ڈانٹتے ہوئے ہنس رہی تھی۔ ان کے آپس کے لڑائی جھگڑے سے تو یہ گھر ہر وقت شور شرابے سے بھرا رہتا تھا۔ وہ دونوں سارے گھر میں پکڑن پکڑائی کا ماحول پیدا کیے ہوئے تھے۔ بلی چوہے کا یہ کھیل تھوڑی دیر چلتا رہا اور آخر جب آمنہ تھک گئی تو اسد نے اُسے پکڑ لیا کان اس کے ہاتھ میں جانے ہی والا تھا کہ وہ فٹ سے بولی۔

''بھائی کتاب آپ کی الماری کے پیچھے رکھی ہے جا کر لے لیں.....''

اُسے وارننگ دے کے وہ کمرے میں گیا۔''اگر کتاب نہ ملی تو آج...........''

اُسے تسلی دیتے ہوئی کہنے لگی۔

''مل جائے گی آپ فکر مند کیوں ہوتے ہیں.....ویسے بھی مجھے اس کتاب کا کیا کرنا میرے بھلا کس کام کی۔ بھاگ بھاگ کے وہ تھک چکی تھی سانس پھولا ہوا تھا اب سیڑھیوں پہ بیٹھی سستا رہی تھی اور ساتھ ہی یہ تسلی بھرے الفاظ کہہ رہی تھی۔ اسد نے الماری کے پیچھے دیکھا تو واقعی کتاب وہاں پڑی تھی۔ مگر کتاب میں اُسے وہ تصویر نہ ملی جو اُس نے کل ہی اس میں رکھی تھی۔ ایک بار پھر اس کے پاس آیا۔

''میری تصویر.....''

پُر رعب انداز میں بولی۔''بھائی کان پکڑنے کی جرأت مت کرنا میں ابھی لاتی ہوں.....''

سیڑھیوں سے اُٹھی اور کمرے میں چلی گئی اور تھوڑی دیر میں تصویر لیے آ گئی۔ غصے سے تصویر پکڑائی۔

''یہ لیجیے.....''

وہ جان گیا تھا کہ وہ ناراض ہو گئی اُسے منانے لگا کچھ دیر نخرے دکھانے کے بعد وہ مان گئی اور دونوں میں پھر سے صلح صفائی ہو گئی۔ اور پھر سے بلی چوہے میں معاہدہ طے پا گیا کہ اب کے یہ آخری لڑائی تھی اب صلح صفائی رہے گی۔ سکینہ اُن کے معاہدے پر ہنستے ہوئے طنز بھرے لہجے میں کہنے لگی۔

''دیکھیں گے یہ معاہدہ کتنی دیر قائم رہتا ہے.....توبہ ہے تم دونوں تو بالکل بچوں کی طرح حرکتیں کرتے ہو حالانکہ اب تم بچے نہیں رہے۔ ایک دو سال میں اپنے اپنے گھروں کے ہو جاؤ گے اب یہ حرکتیں چھوڑ دو.....''

آمنہ نے فوراً جواب دیا۔''ماں جی ابھی ہم بچے ہی ہیں اور ایسے ہی رہنا پسند کرینگے.....کیوں بھائی؟

اسد نے ماں کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ماں جی آمنہ ٹھیک ہی کہتی ہے.....''

سکینہ سمجھ گئی کہ وہ یہ سب بہن کو خوش کرنے کو کہہ رہا ہے۔ وہ جھٹ سے بھائی سے لپٹ گئی، اور سکینہ نے دونوں کو آگے بڑھ کر گلے لگا لیا۔

آمنہ اُس پیار کو محسوس کر رہی تھی جو اُسے ماں اور بھائی کی قربت میں ملا تھا مگر اُس کے قریب ان دونوں میں سے کوئی بھی نہ تھا وہ تو بالکل تنہا تھی۔ اس کے کمرے میں سوائے کلاک کی ٹک ٹک کے شور کے کوئی ہنگامہ نہ تھا۔ سناٹا چھایا ہوا تھا۔ تب اُسے احساس ہوا کہ اب وہ اکیلی رہ گئی ہے۔ بچھڑنے کے غم سے اس کی آنکھیں جھلک پڑیں۔

آج پھر اسد کے بیرون ملک جانے کی جو بات چھیڑی تو وہ غمگین ہوگی۔ وہ تو کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ بھائی اُس سے دور چلا جائے گا۔ وہ چاہتی کہ وہ یہی رہے ان کے پاس اور یوں ہی ہنستے مسکراتے زندگی گزر جائے۔ مگر اسد یہاں رہنے پہ آمادہ نہ تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ دونوں ماں بیٹی اُسے سمجھا رہی تھیں مگر وہ بیرون ملک جانے پہ بضد تھا۔ اُس نے انہیں سمجھایا کہ وہاں اُس کا مستقبل روشن ہے یہاں صرف گزارا ہی ہو پائے گا۔ اچھا مستقبل صرف خواب بن کر رہ جائے گا۔ وہ ان کے لیے بہت سارا روپیہ کمانا چاہتا تھا۔ مگر انہیں روپے پیسے کا کوئی لالچ نہ تھا اگر اُنہوں نے سر تسلیم خم کیا تھا تو صرف اور صرف اُس کی خاطر اُس کے اچھے مستقبل کی خاطر پر آسائش زندگی کی خاطر، اس موضوع پر بات کرتے ہوئے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ بھائی کے قریب جا کر بیٹھ گئی اور پوچھنے لگی۔

''بھائی تم ہمیں بھول تو نہ جاؤ گے؟...... پلیز بھائی ایسا مت کرنا...... پلیز......''

اُس نے ہنستے ہوئے کہا ''ظاہری بات ہے بھول جاؤں گا...... دیکھو نا! وہاں اتنی فرصت تھوڑی ہوتی ہے کہ آپ ایرے غیروں کو یاد کرتے رہو...... اس لیے مائنڈ بالکل بھی نہ کرنا......''

سکینہ تو جان گئی تھی کہ وہ اُس سے مذاق کر رہا ہے اور اُسے سمجھانا چاہ رہی تھی کہ یہ بھائی کی باتوں کو سنجیدہ مت لے مگر وہ تو صرف اور صرف اُس کی باتوں کو سنجیدہ سمجھ رہی تھی اور باقی سب باتیں اُسے مذاق لگنے لگی تھیں۔ ماحول میں چھائی اس اُداسی اور سنجیدگی کو کم کرنے کے لیے اُس نے آمنہ کو چائے لانے کا کہا مگر اُس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔

''امی میرا جی نہیں چاہ رہا...... پلیز آپ بنا لائیں......''

سکینہ چائے بنانے چلی آئی۔ اُس نے ایک بار پھر اپنے سوال کو نئے انداز میں دوہرایا۔

''چلو بھائی ہمیں بھول جانا۔ مگر کیا صائمہ آپی کو بھی بھول جاؤ گے۔''

اُسے تنگ کرنے کو کہنے لگا۔ ''دیکھو بھائی میں تو صاف گوئی کا قائل ہوں۔ اس لیے سچ ہی کہوں گا اور سچ یہ ہے کہ میں تو کسی گوری میم سے شادی کروں گا...... یہ جو پاکستانی چڑیلیں ہیں یہ مجھے بالکل بھی پسند نہیں......''

جب اُس نے محسوس کیا کہ وہ تو کسی کو بھی یاد رکھنے کو تیار نہیں تو وہ بھی آخر دھمکی آمیز لہجے پہ اتر آئی۔ التجا بھی دھمکی میں بدل گئی۔ سوال نے فیصلے کا روپ دھار لیا۔

''ٹھیک ہے...... میں ابھی صائمہ آپی کو بتانے جا رہی ہوں کہ بھائی آپ جیسی چڑیل سے ہرگز شادی کرنے کو تیار نہیں آپ اپنے امیر کبیر

قسم کے کزن کو ہاں کہہ دیں...... کیوں ٹھیک ہے نا!"

اب منت کرنے کی باری اسد کی تھی۔ ہاتھ باندھتے ہوئے بولا۔ "تم تو میری پیاری بہن ہو بھلا میں تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں...... ایسا غضب مت کرنا...... میری توبہ...... میرے باپ کی توبہ جو آئندہ ایسی غلطی کی......"

صائمہ جو اسی طرف ہی آ رہی تھی بولی "ارے یہ آج توبہ کس بات پہ ہو رہی ہے......"

اسد کے چہرے کا تو رنگ ہی فق ہو گیا۔ ایک دم سے گھبرا گیا۔ اور یوں ہی ہاتھ باندھے اشارے سے اُسے کسی بھی قسم کی اُوٹ پٹانگ بات منہ سے نکالنے سے منع کرنے لگا۔ مشکل سے تو آمنہ کو اپنا بدلہ چکانے کا موقعہ ہاتھ لگا تھا اُسے وہ ہاتھ سے کیسے جانے دیتی۔

"صائمہ آپ کی خوشی کی خاطر...... آپ کے اچھے مستقبل کی خاطر...... آپ کو دُکھی ہونے سے بچانے کے لیے......"

اسد نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تم تو جانتی ہو اس کی مذاق کی عادت ہے...... اس لیے اس کی کسی بھی بات کا برا مت ماننا......"

پہلے تو شاید صائمہ کو شک نہ پڑتا مگر اب جو اس نے یوں بات کاٹی تو اُسے لگا کوئی بات ہے جو وہ چھپا رہے ہیں۔ اُس نے آمنہ کو سب کچھ بتانے کی اجازت دے دی۔ آمنہ نے بولنے کے لیے لب کھولے تو فوراً اسد نے اُس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ ادھر وہ منہ کھولتی اُدھر وہ اُس کا منہ بند کر دیتا۔ اس بات سے صائمہ کو ٹینشن ہونے لگی۔ موقعہ پاتے ہی آمنہ نے بتا دیا۔

"بھائی میم کے چکروں میں ہیں......"

بس اتنا سننا تھا کہ صائمہ غصے سے وہاں سے چلی آئی۔ اسد نے اُسے روکنے کی بہت کوشش کی مگر اب وہ کچھ بھی سننے کو تیار نہ تھی۔ وہ پریشان ہو گیا۔

"بھائی پاکستانی چڑیلوں کی فکر کیوں کرتے ہیں؟"

اُس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "میری ماں مجھے معاف کر دو...... اور جو تم نے کہا ہے اس کی تردید کرو تا کہ یہ ٹینس سچوایشن ختم ہو۔"

"ٹھیک ہے میں کوشش کروں گی۔"

"کوشش نہیں...... سب کچھ ٹھیک ہونا چاہیے۔"

"چلیں آپ بھی کیا یاد کرینگے کس سخی سے پالا پڑا تھا۔"

یہ الفاظ اس کی زبان پہ تھے اور وہ ہنس رہی تھی۔ رفعت کو کمرے سے ہنسنے کی آواز آئی تو وہ ایک دم سے ڈر کے بھاگی بھاگی اس کے کمرے میں آئی تو اُسے خود سے باتیں کرتے اور مسکراتے دیکھا تو گھبرا گئی۔ اُس کے پاس گئی۔

"بیٹی کیا ہوا؟"

تب آمنہ کو خبر ہوئی کہ وہ یہاں بیٹھی ہے۔

"کیا بات ہے بیٹی" رفعت نے ایک بار پھر سوال دوہرایا۔

اتنے میں عامر بھی کمرے میں آ گیا۔ ماں کو پریشان دیکھ کر پوچھنے لگا۔ رفعت نے اُسے سب بتایا۔ کہ وہ کس لیے کمرے میں آئی۔ اب ایک کی بجائے دونوں اُس سے اس کے ہنسنے کا سبب پوچھ رہے تھے مگر وہ خاموش رہی۔ عامر اُسے خاموش دیکھ کر اپنی ہانکنے لگا۔ لطیفے سنا سنا کر اُسے ہنسانے کی کوشش کی مگر اُسے تو جیسے کسی لطیفے کی سمجھ ہی نہ آ رہی ہو۔ اس کی مسکراہٹ تو جیسے کھو گئی ہو۔ اس کی مسکراہٹ تو اپنے خاندان کے چھوٹے چھوٹے واقعات سے وابستہ تھی۔ اور کوئی بات اُسے ہنسا ہی نہ پاتی۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ رفتہ رفتہ ٹھیک ہو رہی ہے مگر آئے روز اُس کی اس قسم کی حالت دیکھ کر اُنہیں فکر دامن گیر ہونے لگتی۔ عامر اور اس کی ماں آمنہ سے بہت محبت کرتے تھے۔ اور یہ محبت صرف اس حادثے کی وجہ سے نہ پیدا ہوئی تھی بلکہ یہ دونوں تو اُس سے اس وقت بھی یوں ہی پیار کرتے تھے جب اسد اور سکینہ حیات تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب اُنہیں اس کی زیادہ فکر تھی۔ عامر اپنے دوست کے سامنے قیامت کے روز سرخرو ہونا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ آمنہ کو اس کے گھر وہی پیار و محبت اور شفقت کا احساس ملے جو اُسے اپنے گھر میں ملا تھا۔ وہ اُس کے لیے بہت سی خوشیاں سمیٹنا چاہتا تھا۔ اُسے غموں کے اندھیروں سے باہر نکالنا چاہتا تھا۔ مگر ابھی تک وہ اتنا کامیاب نہ ہو پایا تھا جتنی اُسے امید تھی۔ اس کا تو خیال تھا کہ چند ہی دنوں میں وہ اپنے دوست کی اور اپنی پیاری بہن کو خوشیوں کی طرف لوٹا لائے گا مگر ایسا ممکن نہ ہو پایا۔ دونوں ماں بیٹا اُسے باہر گھمانے لے جاتے مگر وہ چند لمحے گزرنے کے بعد فوراً ہی گھر واپس چلنے کا کہہ دیتی۔ وہ اُسے ہنسانے کی کوشش کرتا تو وہ بناوٹی مسکراہٹ چہرے پہ لاتی اور پھر خاموش ہو جاتی۔ بہت منت سماجت کے بعد گھر سے نکلنے کو تیار ہوتی۔ وہ زیادہ تر گھر پہ بلکہ اس کمرے میں اکیلی رہنے کو ضد کرتی۔



قاری صاحب کو اس علاقے میں مدرسہ قائم کروائے ابھی زیادہ عرصہ نہ بیتا تھا مگر یہاں کے تعلیمی نظام اور سہولیات کی وجہ سے اس میں بچوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ بچوں کی تعداد میں اضافے کا مطلب اس کی کامیابی تھی۔ جس سے اس کی شہرت میں اضافہ ہوا تھا۔ مدرسے کی شہرت میں اضافے نے قاری صاحب کے راہ و رسم بڑھائے۔ اس علاقے اور اِرد گرد کے علاقوں کے امیر اور مخیّر افراد نے ان کے ساتھ روابط استوار کرنے کی کوشش کی جس کے قاری صاحب خود بھی خواہاں تھے۔ ہر روز وہ کسی نہ کسی سے ملاقات کے لیے جاتے انہیں اپنے مدرسے کی کارکردگی سے آگاہ کرتے اور اپنے علاقے کے غریب غربا کو اپنے بچے مدرسے میں داخل کروانے کے لیے ترغیب دیتے۔ آج انہیں اورنگ زیب کے پاس ملاقات کو جانا تھا۔ جو ایک صاحب ثروت شخص تھا اور علاقے میں اس کا رُعب و دبدبہ بھی تھا۔

ہاتھ میں تسبیح پکڑے وہ حویلی آ گئے۔ حویلی میں بہت سے افراد جمع تھے۔ جنہیں دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ بلکہ وہ یہاں کے لوگوں سے بہت خوش تھے سبھی سنت رسول ﷺ کو چہرے پہ سجائے ہوئے تھے۔ اور یہ بات انہیں بہت اچھی لگتی۔ گیٹ پہ کھڑے شخص نے اُن کا نام پوچھا تو انہوں نے کہا۔

”تم جا کر اتنا بتا دو کہ قاری صاحب آئیں ہیں......“

قاری صاحب کا اتنا کہنا تھا کہ وہ شخص بڑی عزت و احترام سے اُنہیں اندر لے آیا۔ یہاں بچھی چارپائیوں پہ بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے

تھے اور سامنے بچھی چارپائی پہ اورنگ زیب تشریف فرما تھے۔ انہیں آتے دیکھ کر وہاں موجود بھی افراد ان کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے اورنگ زیب سے سلام ودُعا کے بعد باقی سب کے ساتھ بھی مصافحہ کیا اور پھر اورنگ زیب نے انہیں اپنے قریب بیٹھا لیا۔ اور نوکر کو ان کے لیے مشروبات لانے کا کہا۔ چند لمحوں میں نوکر مشروب لیے وہاں آ گیا۔ مہمان نوازی کے بعد سرسری سا تعارف ہوا قاری صاحب نے انہیں اپنے مدرسے اور اس کی کارکردگی کے بارے آگاہ کیا جس کو سن کر وہ بہت خوش ہوئے۔ باتوں باتوں میں بُرائی اور بے حیائی کے بارے گفتگو ہوئی تو قاری صاحب تو جیسے پھٹ پڑے ہو۔

''ہمارا ملک دن بدن اس کا شکار ہوتا جا رہا ہے...... بے حیائی کم ہونے کا بجائے بڑھتا جا رہا ہے...... ہمیں اس کو روکنا ہوگا...... ورنہ بہت بڑا عذاب نازل ہوگا۔''

قاری صاحب کے مطابق ان قبائلی علاقوں میں شریعت کی سختی سے پابندی کروائی جاتی تھی مگر میڈیا کی وجہ سے اب یہاں بھی لوگوں میں بغاوت پیدا ہو رہی تھی۔ جس کی روک تھام ضروری ہے۔ اورنگ زیب سمیت وہاں موجود بھی افراد نے ان کی بات کی تائید کی۔ بھی اسے ختم کرنے کے خواہاں تھے۔ اسلام کا بول بالا کرنا ان کا مقصد تھا۔ اس کے لیے وہ ہر ممکن کوشش بھی کر رہے تھے۔ مگر ملک میں بڑھتی فحاشی، بدعنوانی، مغربی یلغار کے مکمل سدباب کے لیے کسی نئی اور جامع حکمت عملی کی ضرورت تھی۔ اور اس کے لیے وہ یہاں کے صاحب ثروت لوگوں کی مدد کے خواہاں تھے۔

قاری صاحب نے وہاں بیٹھے لوگوں کو برائی اور بے حیائی کے خاتمے کے لیے سوچنے کا کہا ملک میں اسلامی قانون نافذ کروانے کے بارے میں بات کی۔ شریعت کی پابندی کا درس دیا۔

ان سب باتوں کا ان پہ بہت اثر ہوا اور وہ ان کی مذہب سے وابستگی اور دین کی خدمت کے جذبے کے گُن گانے لگے۔ کافی دیر بات چیت ہوتی رہی اور پھر قاری صاحب اجازت پا کر وہاں سے رخصت ہو گئے۔



گل شیر اور عبداللہ بچوں کو مدرسے میں بھجوا کے بہت خوش تھے۔ قاری صاحب کی باتیں ان کے مدرسے کا ماحول اور انتظامات نے انہیں دلی خوشی دی اور وہ اس بات پہ مطمئن تھے کہ اُن کے بچے صحیح جگہ پہنچ گئے ہیں وہ اپنے دوستوں کو بھی اس کا مشورہ دینے لگے اور جب جب وہ مدرسے بچوں کی خیر و عافیت کو جاتے نئے بچوں کو ساتھ لیے ہوتے۔ قاری صاحب ان کی تھوڑی بہت مالی مدد کر دیتے۔ جس بات نے ان کے دلوں میں ان کی قدر و منزلت اور بڑھا دی۔ جب وہ قاری صاحب کی زبان سے یہ الفاظ سنتے۔

''ہمیں تم یا تمہارا بچہ سے کوئی لالچ نہیں...... ہم تو یہ سب دین کا خدمت کے لیے کر رہا ہے...... ہمارا پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے اور اسے ہم صرف دین کی خاطر خرچ کرنا چاہتا ہے...... تم جھوتم نے دنیا و آخرت خرید لی ہے۔ تمہارا بچہ یہاں سے فارغ تحصیل ہو کر دین کی سربلندی کے لیے کوشش کرے گا تو تمہارا سر فخر سے بلند ہو جائے گا...... تم مطمئن ہو کے جاؤ...... تمہارا بچہ صحیح جگہ آ گیا ہے۔''

وہ سر اٹھا کر چلتے اور خوشی سے گھر لوٹتے۔ اس مدرسے میں بچوں کو قرآن مجید پڑھنا سکھایا جاتا۔ دین کے مسائل سمجھائے جاتے۔ نماز

پڑھنا سکھایا جاتا اور ملک میں اسلام کی فتح و کامیابی کے لیے تیار کیا جاتا۔ اب تو اکثر و بیشتر قاری صاحب کی ملاقات اورنگ زیب سے ہونے لگی۔ زیادہ تر قاری صاحب ان کی حویلی پہ تشریف لے جاتے مگر کبھی کبھار وہ خود بھی ملنے کو چلے آتے۔ حویلی پر ان کی ملاقات دوسرے دوستوں سے بھی ہو جاتی اس لیے وہ وہاں جانے کو ترجیح دیتے کیونکہ یوں اُنہیں باری باری اُن سے ملنے جانے کی بجائے ایک ہی جگہ سلام و دُعا کا موقعہ بھی مل جاتا۔ وہیں مسائل پہ بات بھی ہو جاتی۔ قاری صاحب کے آنے کی وجہ سے یہاں شریعت پہ سختی سے عمل ہونے لگا تھا۔ عورت کے باہر نکلنے پہ سخت پابندی عائد کردی گئی تھی کیونکہ ان کا خیال تھا یوں برائیاں جنم لیتی ہیں۔ اگر کسی عورت کے لیے باہر نکلنا اشد ضروری ہوتا تو وہ رات کے اندھیرے میں اپنے مرد کے ساتھ برقعہ پہن کر نکلتی۔ سب قاری صاحب کی باتوں کو غور سے سنتے اور پھر اس پہ سختی سے عمل بھی کرواتے۔ موسیقی پہ تو اس قدر پابندی تھی کہ گلی بازار تو دور کی بات لوگ تو گھروں میں بھی اسے سننے سے اجتناب کرتے۔ قاری صاحب نے اُنہیں بتایا تھا۔

''موسیقی روح کی غذا نہیں عذاب ہے...... یہ گناہ کی طرف راغب کرتی ہے۔''

ان سب باتوں کے باوجود یہاں بھی جسم اور روح کی جنگ جاری تھی۔ اس جنگ کی روک تھام اشد ضروری محسوس کرتے ہوئے قاری صاحب نے اپنا حلقہ احباب بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ اب ان کا مقصد لوگوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو اپنی باتوں سے قائل کرنا تھا۔ جس کے لیے انہوں نے اورنگ زیب اور ان جیسے لوگوں کا سہارا لیا۔ قاری صاحب کے کہنے پہ اورنگ زیب نے ایک بہت بڑی مجلس کا اہتمام کروانے کا فیصلہ کیا جس میں شرکت کے لیے جگہ جگہ اعلان کروایا گیا۔ اورنگ زیب نے اپنے علاقے کے لوگوں پہ اس میں شرکت لازمی قرار دے دی اور غیر موجودگی یا عدم حاضری کی صورت میں خطرناک نتائج کی دھمکی بھی لگائی۔



آصف جو کئی دنوں سے جتن کر رہا تھا کہ دوست اس کی ہاں میں ہاں ملائیں آخر کامیاب ہو گیا۔ آج انہوں نے اس کے ساتھ جانے کا وعدہ کر لیا تھا۔ شام کو انہیں جانا تھا اس لیے آصف آج دوپہر کے بعد سے گھر سے نہ نکلا تھا۔ بیٹے کو گھر پہ پا کر ماں کچھ حیران سی تھی مگر جب آصف نے وجہ بتائی تو مطمئن ہو گئی۔ اور ان کے لیے کھانا بنانے لگی۔ وہ کچن میں مصروف تھی اور آصف کمپیوٹر پہ بیٹھا کام کر رہا تھا کہ دروازے پہ دستک ہوئی۔ پہلے تو وہ آصف کو آوازیں دیتی رہیں مگر جب دیکھا کہ وہ نہیں سن رہا تو خود ہی دروازے پہ آ گئیں۔

''سلام آنٹی''

اُنھوں نے سلام کا جواب دیا۔

''اندر آ جاؤ...... آصف اپنے کمرے میں ہے......''

اب وہ آصف کے کمرے میں چلے آئے۔ تھوڑی دیر گپ شپ ہوتی رہی۔ چائے پی کر انہوں نے جانا چاہا تو آصف کی ماں نے اُنہیں کھانے تک روک لیا۔ وہ بھی اتنی جلدی جانے کے حق میں نہ تھا۔ کیونکہ ابھی کافی وقت باقی تھا۔ سب کہنے لگے۔

''اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں...... نیکی اور پوچھ پوچھ''



اورنگ زیب کی حویلی پہ بھی آج مجلس کا اہتمام کیا گیا تھا۔ لوگوں کی بہت بڑی تعداد یہاں جمع تھی کچھ خوشی سے آئے تھے تو کچھ ڈر خوف کی وجہ سے شامل ہوئے تھے۔ بہر حال انہیں آنا تھا اور وہ آ گئے تھے۔ سب قاری صاحب کی آمد کے منتظر تھے اور آخر وہ تشریف لے آئے۔ ان کے ساتھ ان کے تمام دوست واحباب بھی تھے۔ ان کی آمد پہ احاطے میں خاموشی طاری ہو گئی۔ اور پھر انہوں نے اپنی بات کا آغاز کیا۔

''ہم تمہاری شرکت پہ بہت خوش ہے...... ہمارے دلوں میں یہ ہی جذبہ ہونا چاہیے...... ہم اپنی بات کا آغاز ایک حدیث مبارکہ سے کرتا ہے آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔

''کمزور مسلمان سے قوت والا مضبوط مسلمان بہتر ہے۔ اور اللہ کے نزدیک پیارا ہے۔ ہر وہ چیز جو تجھے نفع دے اس کی خواہش کر اور اللہ سے مدد طلب کر اس بارے کمزوری نہ دکھا۔''

ہم کو آپ ﷺ کے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمت، جرأت اور بلند حوصلہ مومن کا شیوہ ہے یہ تو ایک مومن کی تعریف تھی اب اس معاشرے کا ذکر بھی لازمی ہے۔ جس میں یہ مومن رہتا ہے...... یہ وہ معاشرہ ہوتا ہے۔ جہاں نیکی اور بدی کا پہچان ہوتا ہے...... جہاں نیکی سے رغبت اور برائی سے نفرت پایا جاتا ہے...... نیکی سے رغبت اور برائی سے نفرت صرف اس صورت میں ممکن ہوتا ہے جب ہم کو کوئی اس کے بارے میں بتائے ...... برائی کرنے پر تنبیہ کرے...... یعنی ایک جماعت ہو جو دعوۃ وارشاد کا کام میں مصروف رہے...... لوگوں کو کتاب وسنت کی طرف بلائے ...... کیونکہ جب لوگ برائی کا طرف مائل ہونے لگتا ہے اور بھلائی کا بارے سستی کا شکار ہوتا ہے تو یہ ہی وہ جماعت ہوتی ہے جو ان کو جھنجھوڑتا ہے۔

شاہ عبدالقادر کا فرمان ہے۔

مسلمانوں میں مستقل طور پر ایک جماعت موجود رہنا چاہیے جو جہاد اور دین کا باتوں کا خیال رکھے......۔
سورۃ توبہ میں حکم آیا ہے۔
''ہر ایک جماعت میں سے ایک گروہ دین میں سوجھ بوجھ حاصل کر کے اپنا قوم کو ڈرائے تاکہ وہ برائی سے بچیں۔''
آپ ﷺ اور صحابہ اکرم نے یہ کام کیا۔ آج بھی مختلف جماعت یہ فریضہ انجام دے رہا ہے۔ معاشرہ کی اصلاح کے لیے ہم کو بھی اپنا حصہ ڈالنا کا ضرورت ہے۔ اگر ہم یہ نہیں کرے گا تو گناہ گار ہوگا۔''

☆

کھانا کھا چکنے کے بعد آصف بھی دوستوں کو لیے مولانا صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ یہ ایک بڑا سا ہال تھا جہاں بہت سی کرسیاں بچھی ہوئیں تھیں۔ سبھی بھر چکی تھیں بس آخر میں چند خالی پڑیں تھیں وہ سب ان خالی کرسیوں پر آ کے بیٹھ گئے۔ چند لمحوں کے انتظار کے بعد مولانا صاحب تشریف لے آئے۔ تلاوت قرآن پاک کے بعد گفتگو کا آغاز ہوا۔
''ہم پر آج جو مشکل اور کٹھن وقت آیا ہوا ہے شاید ہماری نوجوان نسل نے اس قسم کی صورت حال نہ دیکھی ہو۔ جن حالات کا ہمیں سامنا ہے۔ اس سے نکلنے کے لیے ہمیں ہمت و حوصلے اور تدبر کی ضرورت ہے...... تدبر...... یعنی سوچ بچار سے کسی چیز کے نتائج پر پہنچنا...... بنیادی طور پر انسان کو حیوانات سے جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ اس کی دور اندیشی اور منصوبہ خیز عقل ہے...... جو لوگ تدبر سے کام نہیں لیتے وہ چوپایوں سے بھی بدتر ہیں۔ اور ان کی حالت وہی ہوتی ہے جو آج ہمارے ملک و قوم کی ہے...... ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔
''وہ دل رکھتے ہیں لیکن ان سے سمجھ کا کام نہیں لیتے۔ وہ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ ان کے کان ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے وہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر بے راہ ہیں۔ وہی لوگ غافل ہیں۔''
ہمیں اپنے عقل و شعور کو دستک دیکر بیدار کرنے کی ضرورت ہے...... تفکر کی طرح کی کوئی عبادت نہیں۔ ایک گھڑی تفکرات بھری نماز گزاری سے بہتر ہے...... ایک فقیر ہزار عابدوں سے بڑھ کر شیطان پر بھاری ہے...... مگر افسوس کہ ہم یہ سب بھول چکے ہیں...... آج ملک تباہی کے دہانے پر ہے اور ہم سب اپنی اپنی دنیا میں کھوئے ہوئے ہیں...... کسی کو اس ملک کو بچانے کی فکر نہیں...... ہمیں آج اس بات پر غور و غوض کی ضرورت ہے کہ آخر ہماری اس حالت کی وجہ کیا ہے؟...... کیا چیز ہے جو دن بدن ہمارے لیے مصیبت بنتی جا رہی ہے؟...... غور کریں...... سوچیں کہ کہیں ہمارے اندر کوئی خامی تو نہیں...... کہیں یہ دین سے دوری کا نتیجہ تو نہیں...... کیا ہم بھٹک گئے ہیں۔ ایسے بہت سے سوالات ہیں۔ جو ہم خود سے کر سکتے ہیں...... سوچیں...... غور کریں...... اگر ہم میں سے ہر ایک غور کریں تو یقیناً کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔
مولانا صاحب کی باتیں ان کے دلوں پر گہرا اثر چھوڑ رہیں تھیں۔ وہ مگن ہوئے ان کی باتیں سن رہے تھے یہ اسی انہماک کی وجہ تھی کہ انہیں اس وقت ہوش آیا جب مولانا صاحب نے اپنی بات ختم کی اور سب سے ملکی سلامتی کے لیے دُعا کرنے کا کہا۔ اوروں کے ساتھ مل کر انہوں نے بھی دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے سب نے رو رو کر ملکی سلامتی اور لوگوں کی زندگی کے لیے دُعا کی۔ شر پسندوں کی ہدایت کے لیے خاص طور پر ہاتھ اُٹھائے گئے۔ اور پھر جب وہ واپس آ رہے تھے تو انہوں نے آصف کی بات کی تائید کی کہ واقعی مولانا صاحب بالکل مختلف انسان ہے۔ واقعی ان کا مقصد

شر پسندی نہیں بلکہ امن وسلامتی، خیر وعافیت ہے۔ کالج میں بھی وہ مولانا صاحب کے بارے باتیں کرتے رہے اوران کے کہے گئے الفاظ پر بھی غور و غوض کرتے رہے۔ اپنی کوتاہیوں کے بارے سوچتے رہے۔ اب تو انہوں نے باقاعدگی سے کلاسز لینا شروع کردیں۔ کیونکہ وہ جان گئے تھے کہ اگر اس ملک کا ہر فرد اپنا فرض ادا کرے تو یقیناً معاشرے میں پھیلی بدنظمی ختم ہو جائے گی کیونکہ جب انسان فارغ ہوتا ہے تو وہ شر پسندی کی طرف جاتا ہے۔ بدنظمی کا باعث بنتا ہے۔ طالب علم کے طور پر اُن کا فرض اپنی تعلیم پر مکمل توجہ دینا تھا ادھر اُدھر کی ہانکنے کی بجائے تعمیری سوچ کو جنم دینا تھا۔

مولانا صاحب کے ہاں حاضری نے ان سب کی زندگیوں میں نیا باب رقم کر دیا تھا۔ وہ فرصت کے لمحات میں ان کے پاس جاتے۔ مسائل کا تذکرہ کرتے اوران کے حل کے لیے ایسی ایسی تجاویز حاصل کرتے جواُن کے ذہن وخیال میں بھی نہ ہوتیں۔ جب بھی کوئی پریشان کن صورت حال جیسے کہ بم دھماکہ پیش آتا وہ اس صورت حال میں اپنے کردار کو جاننے کے لیے ان کے پاس ضرور جاتے۔

مولانا صاحب کے نزدیک ایسی صورت حال میں ان کا کردار دوسروں کی مدد کرنا اور آئندہ ایسی صورت حال کو جنم دینے سے روکنے کے لیے حتی الامکان مشتبہ لوگوں اور چیزوں کی نگرانی کرنا تھا۔ کسی بھی قسم کی جوابی کاروائی کے وہ متحمل نہ تھے اُن کے نزدیک یہ کام حکومت کا ہے۔ پہلے بھی اس صورت حال کا سامنا اسی وجہ سے کرنا پڑ رہا تھا کہ چند لوگوں نے اصلاح کا بیڑا اُٹھانے کی کوشش کی ہے۔



آمنہ کی دنیا اب بھی انہی خیالوں کے گرد گھومتی تھی جن سے نکلنے کو وہ ہرگز تیار نہ تھی۔ ہر وقت وہ خود کو ان کے سپرد کیے رکھتی۔ اردگرد کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ کون آ رہا ہے؟ کون جا رہا ہے؟ اُسے کچھ خبر نہ تھی اکثر یوں ہی بیٹھے بیٹھے کہیں کی کہیں جا پہنچتی۔ آج بھی لان میں بیٹھے وہ آسمان میں اُڑتے پرندوں کو دیکھ رہی تھی کہ آسمان سے وہ سڑک پہ پہنچ گئی۔

وہ اور اسد باتیں کرتے ہوئے سڑک پر چلتے جا رہے تھے۔ یہ ایک ویران سی سڑک تھی لہٰذا ٹریفک کا کوئی ڈر خوف نہ تھا اور اس بنا پر ایکسیڈنٹ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا پھر بھی احتیاطاً وہ ایک کنارے چل رہے تھے تاکہ اگر خدانخواستہ اچانک کوئی گاڑی آ بھی جائے تو کسی قسم کے خطرناک حالات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

باتیں کرتے کرتے وہ کافی دور نکل آئے تھے۔ اسد کو شرارت سوجھی اور اچانک جب وہ ایک درخت کے قریب سے گزرے تو وہ اُس کے پیچھے چھپ گیا۔ درخت کا تنا کافی موٹا تھا اس لیے وہ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ وہ اپنی دنیا میں کھوئی باتیں کیے چل رہی تھی۔ جب کافی دیر اسد نے اس کی کسی بات کا جواب نہ دیا تو وہ ایکدم سے ڈر گئی۔ وہ اس وقت بالکل تنہا تھی دور دور تک کوئی نہ تھا۔ اسد بھی غائب ہو چکا تھا۔ خود کو اکیلا پا کر اُس کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ پاگلوں کی طرح بھائی کو پکارنے لگی۔

''بھائی...... بھائی......''

وہ اُسے پکارتے ہوئے بھاگ رہی تھی۔ مگر اسد اُسے کہیں بھی دکھائی نہ دیا اور نہ اُس نے اس کی کسی بات کا جواب دیا۔

''اسد...... کہاں ہو؟ جلدی سے آ جاؤ بھائی میں اکیلی ہوں...... جلدی سے آ جاؤ...... تم کہاں چلے گئے ہو؟ تم بولتے کیوں نہیں؟''

اُس کی زبان پہ ڈھیروں سوال تھے مگر اس کے سوالوں کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا۔ وہ تھک ہار کر رونے لگی وہ اس درخت کے قریب کھڑی رو رہی تھی کہ اسد درخت کے پیچھے سے نکل کر اُس کے سامنے آ گیا۔ وہ ڈر گئی مگر جب دیکھا کہ اسد ہے۔

''بھائی آپ بہت گندے ہیں...... یہاں بھی شرارتوں سے باز نہیں آئے...... اگر خدانخواستہ میں ڈر کے مارے بے ہوش ہو جاتی یا پاگل تو......''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''تم بے ہوش ہونے والی نہیں اور جہاں تک پاگل ہونے کا سوال ہے تو تم سب کو پاگل کر کے بھی پاگل نہ ہو...... ویسے میں حیران اس بات پہ ہوں کہ خود کو شیر کہنے والی تنہائی سے ڈر گئی اکیلے پن نے خوفزدہ کر دیا...... ایک اور بات بھی میرے ذہن میں آ رہی ہے۔''

''کہہ دیں...... وہ بھی کہہ دیں......''

''ویسے تم بھاں بھاں کر کے روتے ہوئے بالکل چڑیل لگ رہی تھی......''

''اچھا تو آپ نے مجھے چڑیل کہا...... ابھی آپ کو پوچھ لیتی ہوں......''

اب اسد آگے آگے اور وہ اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ بھاگتے بھاگتے وہ تھک گئی مگر اسد اُس کے ہاتھ نہ لگا۔ آسمان میں بنا سڑک کا نقشہ آہستہ آہستہ مٹ گیا اور وہ پھر آسمان کو دیکھنے لگی اب اس کی نظریں پرندوں پر پڑیں وہ غول تو کب کا یہاں سے جا چکا تھا اب تو وہ اپنے گھونسلوں تک بھی پہنچ گئے ہونگے مگر پرندوں کا ایک غول ابھی بھی سفر کر رہا تھا۔

وہ ان اُڑتے پرندوں کا انسانوں سے موازنہ کرنے لگی۔ اُسے ان کے اور انسانوں کے درمیان ہر بات مشترک لگ رہی تھی۔ وہی اُٹھنا، روزی کے لیے تگ و دو کرنا، شام ڈھلے گھروں کو لوٹنا، بچوں کو محنت مزدوری کر کے پالنا، پروان چڑھانا اور پھر انہیں ان کی نئی دنیا میں بھیجنا۔ وہی زندگی وہی موت، موت میں بھی دونوں میں مماثلت پائی جاتی تھی دونوں طبعی موت سے بھی مرتے ہیں ایکسیڈنٹ سے بھی اور گولی سے بھی۔ وہی گولی جو زمین پر چلتے انسان کو بھی اسی بے دردی سے مارتی ہے جس بے دردی سے آسمان میں اُڑتے پرندے کو یا درخت پر بیٹھے کو۔ گولی مارنے والا بھی ایک ہی ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پرندے پرندوں کو گولی نہیں مارتے۔ مگر انسان انسانوں کو ضرور مار دیتے ہیں۔ انسان کے اس ظلم کے بارے سوچتے ہوئے اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

کتنا ناداں ہے تو اے انسان
تیرا دشمن بھی ہے اک انسان

وہ کوئی شاعرہ نہ تھی مگر انسان کی بے رحمی کے بارے سوچ نے خود بخود لفظوں کا رنگ لے لیا تھا۔ انسان ہی ایک دوسرے کی زندگی تباہ کرتے ہیں۔ گھر اُجاڑتے ہیں پیاروں کو چھین لیتے ہیں۔ خوشیاں برباد کر کے غموں میں بدل دیتے ہیں۔ آخر کیوں؟ اس سوال پہ آ کے وہ اٹک گئی۔ کافی دیر سر کھپاتی رہی مگر کوئی جواب نہ مل پایا۔ تھک ہار کے وہاں سے اُٹھ گئی اور اندر کمرے میں آ کر بیٹھ گئی۔



قاری صاحب نے رفتہ رفتہ لوگوں کو اس بات کی طرف مائل کرنا شروع کر دیا تھا جو ان کا بہت بڑا مقصد تھا۔ شروع شروع میں دائرہ کار چند دوست واحباب تک تھا۔ مگر اب انہوں نے اپنے دائرہ کار کو بڑھانے کی کوشش کی دوست واحباب نے ان کا بہت ساتھ دیا اور یہ اُنہی کی بدولت تھا کہ اب بہت سے لوگ ان کی بات سن رہے تھے۔ قاری صاحب نے مدرسے میں جمع لوگوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا۔

آپ ﷺ کا فرمان ہے:

''جو آدمی دیکھے تم میں سے کسی برائی کو پس اس کو چاہیے کہ وہ اُسے ہاتھ سے بدل دے یعنی روک دے۔ اگر اتنی طاقت نہیں تو زبان سے روک دے اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو اُسے اپنے دل میں بُرا جانے اور یہ کمزور ترین ایمان ہے۔''

کسی بھی شخص کے لیے اتنا کافی نہیں کہ وہ غلطی کرنے والے کو بتائے۔ بلکہ اس کا یہ بھی ذمہ داری ہے کہ آگے بڑھے برائی کو ختم کر کے اس کی جگہ نیکی اور اچھائی لائے...... گویا ہر وہ بندوبست کرے جو برائی کے انسداد اور نیکی کے فروغ کے لیے کیا جا سکتا ہے......

پہلے پیار بھرے انداز میں سمجھاؤ مگر اصلاح نہ ہو تو تعلقات منقطع کر دو اور اگر پھر بھی ایسا نہ ہو تو جسمانی سزا دو...... برائی کی زبانی مذمت سے زیادہ جدوجہد پر زور دو۔

آپ ﷺ کا فرمان ہے!

''لوگو! اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن منکر کرتے رہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ وقت آ جائے کہ تم دُعا کرو اور وہ قبول نہ ہو...... تم سوال کرو اور سوال پورا نہ کیا جائے تم دشمن کے خلاف مجھ سے مدد چاہو اور میں تمہاری مدد نہ کروں۔''

''تم برائی کا انسداد سے ہرگز نہ رکنا حتیٰ کہ ظالم کا ہاتھ پکڑ لو اور اسے حق کی طرف جھکا دو......''

جب بنی اسرائیل پر عذاب آیا تو وہ لوگ بھی اس میں مبتلا ہوئے...... جو برائی نہ کرتا تھا...... مگر روکتا بھی نہ تھا، ہوش میں آؤ...... کہیں ہمارا ساتھ بھی ایسا نہ ہو۔

لوگ قاری صاحب کی باتوں کو بڑے غور سے سن رہے تھے اور دل میں اس پر عمل پیرا ہونے کا تہیہ بھی کر چکے تھے۔

☆

رفعت نے آمنہ کو اس جیتی جاگتی دنیا میں لانے کی بہت کوشش کی اور اب بھی کر رہی تھی جہاں وہ ہر وقت ہنستی گاتی رہتی تھی۔ مگر اُسے تو جیسے پلٹنے کا شوق ہی نہ رہا تھا۔ وہ تو صرف زندگی کے دن کاٹ رہی تھی سانسوں کی ڈور جب تک بندھی رہتی ہے انسان کو جینا پڑتا ہے چاہے وہ جینا چاہے یا نہیں یہ بات رفعت کئی دنوں سے اُسے سمجھا رہی تھی مگر وہ یہ سمجھ ہی نہ پا رہی تھی۔ آخر کار رفعت اور عامر نے فیصلہ کیا کہ وہ اس کی زندگی کا رخ ہی بدل دینگے کیونکہ نئے موڑ پر نئے لوگوں سے ملاقات شاید اُس کی سوچ کا دھارا بدل دے۔

رات کے کھانے پر جب وہ اکٹھے ہوئے تو رفعت نے کہا۔

''بیٹی رونے سے مرنے والے کبھی واپس نہیں آیا کرتے بلکہ اس سے اُن کی روح کو تکلیف پہنچتی ہے۔''

ایک بار پھر آنسو اُس کی آنکھوں میں تیر رہے تھے مگر وہ انہیں ضبط کرتے ہوئے بولی۔

''آنٹی انسان بیچارے کے پاس سوائے آنسو بہانے کے کوئی چارا بھی تو نہیں۔''

عامر جھٹ سے بولا۔

''غلط بالکل غلط...... انسان کو چاہیے کہ وہ دوسروں کو ایسی صورت حال سے بچانے کی کوشش کریں جس سے گزر کے اُن کے آنسو بہنے لگے تھے۔''

نوالہ ہاتھ میں پکڑے وہ بولی ''بھائی پر ہجوم دنیا میں اُن نقاب پوش لوگوں کو ڈھونڈ نا مشکل ہوتا ہے جو ہمارے آنسوؤں کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔''

''انہیں تلاش کرنا ہی تو اصل بہادری ہے۔ اس سے نہ صرف اور بہت سے لوگ بچ سکتے ہیں بلکہ مرنے والوں کی روح کو بھی تسکین ملتی ہے......'' عامر نے اُس کا حوصلہ بڑھایا۔

''مگر......''

عامر نے تجویز دیتے ہوئے کہا۔

''تم ایک پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ اگر اپنے علم کو بروئے کار لاؤ تو دوسروں کو بہت فائدہ ہوگا......''

اس گتھی کو سلجھاؤ...... ان وجوہات کو تلاش کرو جن کی وجہ سے یہ سب ہو رہا ہے...... میرا ذہن اس بات کو ماننے کو تیار نہیں کہ ایک مسلمان اتنا ظالم ہو گیا ہے کہ خود اپنی مسلمان بھائی کو موت کی گھاٹ اُتار دے...... اور وہ بھی اُسے جو بے گناہ ہے...... حقائق تلاش کرو...... وجوہات جانو......

عامر کی باتوں کو وہ بڑے غور سے سن رہی تھی اُس نے دل میں ٹھان لی تھی کہ وہ ضرور یہ سب جاننے کی کوشش کرے گی تا کہ ان لوگوں کو یوں مرنے سے بچا سکے۔ عامر کی باتوں نے اس میں نیا جذبہ پیدا کر دیا۔ نئی سوچ کو جنم دیا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ کر دکھانے کے جذبے کی چمک اُبھر آئی۔



گل خان اور سیف الرحمٰن آج پھر بچوں کو لے جانے آئے تھے۔ ان کا مقصد تھا کہ اب یہاں نئے بچوں کو رکھا جائے۔ پہلے پہل تو یہ بچے روتے دھوتے رہے مگر اب ان کے آنسو مکمل طور پر تھم چکے تھے۔ کچھ دنوں میں وہ کافی حد تک بدل چکے تھے۔ مگر والدین سے بچھڑنے کا دُکھ ابھی تک اُن کے دلوں میں تھا۔ مگر اب انہوں نے دلوں کو دلاسا دینا چھوڑ دیا تھا کہ وہ پھر سے والدین سے مل سکیں گے۔ سلاخوں سے سر ٹکرا ٹکرا کر وہ تھک چکے تھے۔ اور اب جب انہیں منتقلی کا علم ہوا تو ایک بار پھر سے گھبرا گئے۔ اب انہوں نے یہاں رہنا تو سیکھ لیا تھا مگر نئی جگہ جانے کیسی ہو وہاں اُن کے ساتھ کیسا سلوک ہو؟ ان سوچوں اور سوالات نے اُن کے ذہن کو پھر سے اُلجھا دیا تھا۔ مگر ان کے اندر اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ ان سوالات کے جوابات جان سکیں۔ گل خان نے بچوں کو قطار میں کھڑا کیا اور پھر جب سیف الرحمٰن نے بھجوانے کا اشارہ کیا تو وہ باری باری ایک ایک کو جانے کا اشارہ کرتا رہا۔ گاڑی میں وہ اپنی اپنی سیٹوں پہ بیٹھ گئے۔ جب سب بیٹھ چکے تو گل خان نے ڈرائیور کے ساتھ دھیمی آواز میں بات چیت کی جسے سننے کی انہوں

نے بہت کوشش کی مگر نہ سن پائے۔ یہ گفتگو زیادہ لمبی نہ تھی اس لیے چند ہی لمحوں بعد ڈرائیور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سیف الرحمن نے آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے انہیں وارنگ دی۔

"بھاگنے کا کوشش مت کرنا ورنہ مر جاؤ گے......"

سب نے یک زبان ہو کر "جی" کہا۔

پھر گاڑی کا دروازہ بند ہوا اور وہ ہمیشہ کے لیے اس اجنبی جگہ سے نئی جگہ کی طرف چل دیے۔ گاڑی پہاڑی راستوں پہ چل رہی تھی۔ ایک دو بچوں نے کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کی مگر بے کار انہیں باہر کچھ بھی دکھائی نہ دے رہا تھا کیونکہ گاڑی کے شیشے عام گاڑیوں جیسے نہ تھے۔ اور یہ سب اس لیے کیا گیا تھا کہ وہ راستے نہ پہچان سکیں۔ یہ کوشش ناکام ہوئی تو انہوں نے آپس میں گفتگو شروع کر دی۔

"یار یہ جانے ہم کو کہاں لے جا رہے ہیں؟"

"ہم کو خود بھی معلوم نہیں......"

"آج ہماری طرح وہاں کچھ نیا بچہ لایا گیا ہے............"

اُس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"تم کو کیسے معلوم؟"

"ہم نے خطرناک گل خان اور اُلو کی آنکھوں والے سیف الرحمٰن کو باتیں کرتے سنا تھا......"

"کب؟"

"جب وہ ہم کو لے جانے کا بات کر رہا تھا......"

"اچھا تو پھر تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ کون ہیں؟"

"ہمارا جیسا......"

"کیا مطلب ہمارے جیسا؟"

"یار ہم وہاں کیسے پہنچا تھا؟ اغوا ہو کر بالکل اسی طرح ان لوگوں نے اُنہیں بھی اغوا کیا ہوگا......"

ڈرائیور کو جو سرگوشیوں کی بھنک پڑی تو غصے سے بولا۔ "تم آپس میں بات چیت بند کرو...... ورنہ ہم ابھی تمہارا بندوبست کر دے گا......"

یہ سننا تھا کہ وہ ڈر گئے اور سہمے ہوئے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیں جسے بلی کے جھپٹا مارنے کا علم ہو گیا ہو۔ اب وہ بیچارا اُڑ تو سکتا نہیں تھا اس لیے موت کو قریب پا کر آنکھیں بند کرنے کے سوا اس کے پاس کوئی اور چارا بھی نہ تھا۔ اب گاڑی میں مکمل خاموشی تھی۔ کچھ بچے تو بیٹھے بیٹھے سو گئے مگر کچھ کی آنکھوں سے اُس خوف نے نیند چھین لی تھی جو نئے مقام کے بارے ان کے ذہنوں میں بھرا ہوا تھا۔ بے بس و مجبور اور قیدی پرندے کی طرح ان کے پاس اپنے پنجرے کو دیکھنے کے سوا کوئی اور راستہ نہ تھا۔ چپ چاپ گاڑی کی چھت کی طرف تکنے لگے۔

پھر ایک مدھم سی آواز ابھری۔''یار اکبر......''

ہلکی سی آواز آئی''ہو......''

''کیا دیکھ رہے ہو؟''

''کچھ نہیں......''

پھر خاموشی طاری ہوگئی۔

تھوڑی دیر بعد اکبر نے کہا۔''بہادر کیا دیکھ رہے ہو؟''

بہادر بولا۔ ''کچھ نہیں بس امی ابا یاد آ رہے ہیں......''

اکبر نے کہا ''ہم کو بھی......مگر اب ہم اُن سے مل نہیں سکتا۔ہم ہمیشہ کے لیے ان کا قید میں رہے گا......''

بہادر نے سوال کیا۔''تم کو معلوم ہے ہم کدھر جا رہا ہے؟''

اکبر نے کہا ''ہم کو کیا معلوم؟......مگر ہم کو ڈر ضرور لگ رہا ہے......''

سرگوشیوں کی آواز سن کر ڈرائیور نے پھر اُسی قسم کے دھمکی آمیز الفاظ کہے۔اب تو ایسی خاموشی طاری ہوئی کہ پھر سنٹر کے اندر جا کے بھی ختم نہ ہو پائی۔آدھی رات کو وہ اپنی منزل پر پہنچ گئے۔جوں ہی گاڑی رُکی سب ہڑ بڑا کے اُٹھ گئے اور دروازے کے کھلنے کا انتظار کرنے لگے چند ساعتوں بعد دروازہ کھولا۔اب ڈرائیور کی جگہ ایک نیا آدمی تھا۔

دروازے کے پاس کھڑا وہ تلخ لہجے میں بولا۔''جلدی سے نیچے اترو......دیکھو باری باری آنا ایک دوسرے کو دھکے مت دینا۔''

ایک ایک کر کے وہ گاڑی سے اُتر رہے تھے۔بہادر اور اکبر جو گاڑی کی عقبی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ایک دوسرے کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے کہہ رہے ہو۔آخر ہم پہنچ گئے کتنا اچھا ہوتا جو سفر جاری رہتا کبھی منزل نہ آتی۔جانے اب ہمارے ساتھ کیا سلوک ہو۔وہ ان سوچوں میں گم تھے کہ آواز آئی۔

''تمہارے واسطے کوئی نیا آرڈر آئے گا......''

اس آواز پر وہ چونک گئے۔اِدھر اُدھر دیکھا تو ان کے علاوہ گاڑی میں کوئی بھی نہ تھا۔

''جلدی کرو......نیچے اُترو......''

وہ جلدی سے گاڑی سے اُتر آئے۔رات کے اندھیرے میں اُنہیں کچھ صاف دکھائی نہ دے رہا تھا۔ڈرائیور ہاتھ میں لالٹین لیے کھڑا تھا اس کی مدھم روشنی میں جو تھوڑا بہت نظر آیا اُس سے وہ یہ ہی اندازہ لگا پائے کہ یہ ایک بڑے رقبے پر پھیلا ہوا کوئی اسکول ہے جہاں چند کمروں کے سوا کچھ نہ تھا۔قطار میں کھڑے ہوکے وہ اِرد گرد کا اندازہ لگا رہے تھے۔ڈرائیور نے اس اجنبی شخص کو لالٹین پکڑائی اور بولا۔

''اب ہم کو اجازت دو......''

''اچھا خدا حافظ......''

ڈرائیور نے سلام لیا اور پھر سے گاڑی سٹارٹ کر کے وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اُسے جاتا دیکھ کر بہادر کا جی چاہا کہ وہ بھی اُسے اپنے ساتھ لے چلے اُسے اس کے گھر پہنچا دے جہاں وہ اپنے بہن بھائیو اور والدین کے ساتھ رہ سکے۔ مگر ایسا ممکن نہ تھا کیونکہ ڈرائیور تو جا چکا تھا۔ اب وہاں دو تین لوگ اور آ گئے اور انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتے ہوئے لے گئے۔

☆

سنبل نے بچوں کو مدرسے تو داخل کروا دیا مگر اب اُسے ہر وقت ان کی فکر لگی رہتی تھی۔ حالانکہ اس کے ارد گرد کے بہت سے گھروں میں سے بچے مدرسے داخل تھے اور ان کے والدین اپنے اس فیصلے پر خوش و خرم اور مطمئن بھی نظر آتے تھے۔ اکثر اس کی ماؤں سے بات چیت ہوتی تو وہ یہی کہتی کہ ان کے بچے وہاں بہت خوش ہیں اور وہ بھی۔ اس طرح ان کے بچوں کو کم از کم کھانے کو تو مل جاتا ہے نا! ورنہ یہاں تو وہ فاقوں سے ہی مر جاتے مگر سنبل کے دل کو قرار نہ آ رہا تھا۔ سارا دن بچوں کو یاد کرتی رہتی تھی۔ شیر گل سے بھی بچوں کے بارے باتیں کرتی رہتی۔ اب وہ بیوی کی ان باتوں سے تنگ آنے لگا تھا۔ اور اب تو وہ بچوں کا ذکر کرتی تو غصے سے کہنے لگتا۔

''اوروں کا بچہ بھی مدرسے میں جاتا ہے...... مگر ان کا بیوی تمہاری طرح تفتیش نہیں کرتا...... تم کو تو شکر کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارا بچہ کو دین کی خدمت کے واسطے چنا ہے...... قاری صاحب کہتا ہے تمہارا بچہ دین کی جو خدمت کرے گا تو نہ صرف اللہ راضی ہوگا بلکہ تمہارا دنیا و آخرت بھی سنور جائے گا...... بڑا ابوڑھا ٹھیک ہی کہتا ہے۔ تم عورت لوگ کا عقل تھوڑا ہوتا ہے...... جاؤ اپنا کام کرو اور ہمارا بھی دماغ چاٹنا بند کرو۔''

شوہر کی باتیں سن کر وہ خاموش ہو جاتی اور کسی کونے میں جا کے چند آنسو بہا لیتی۔ یوں اس کے دل کا تھوڑا سا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔ دو چار بار شیر گل نے اُسے جو روتا دیکھا تو اس کو تھوڑی بہت تسلی دی۔ مگر جب سنبل نے دیکھا کہ اس کی باتوں سے اس کا شوہر عاجز آنے لگا ہے تو وہ خاموش ہو گی۔ اُداسی کو دل میں ہی رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ یاد کو زبان تک آنے سے روک لیا۔ شیر گل نے اُس کی یہ جو حالت دیکھی تو بچوں سے ملنے کو گیا۔ انہیں وہاں خوش و خرم دیکھ کر اس کے دل کو اطمینان ہو گیا۔ اب تو اُسے بیوی کا رونا دھونا خاموش رہنا بالکل ہی فضول لگتا تھا۔ وہ ان سب باتوں سے بے نیاز ہو کر کام کاج کرتا اور محنت مزدوری سے جو کماتا وہ جب بھی مدرسے جاتا بچوں کو کچھ نہ کچھ لے کے دے آتا۔

عبداللہ نے بھی کچھ ہی عرصے میں اپنے باقی کے بچوں کو بھی مدرسے میں داخل کروا دیا۔ اب وہ محنت مزدوری کر کے جو چار آنے کماتا بیوی کے دوا دارو پر لگا کے بیٹھ جاتا۔ بچوں کی ذمہ داری تو اب رہی نہ تھی اس لیے اُسے بیوی کے علاج معالجے میں دقت پیش نہ آ رہی تھی۔ علاج معالجے سے جو تھوڑی بہت رقم بچ جاتی اُسے وہ کرائے پر خرچ کر کے بچوں سے مل آتا ان کا حال احوال معلوم کر لیتا۔ انہیں دیکھ کر خدا کا شکر ادا کرتا۔ کہ اس ذات باری تعالیٰ نے ان کی روٹی کا بندوبست کر دیا ہے۔

قاری صاحب نے لوگوں میں یہ سوچ بیدار کر دی تھی کہ اس وقت ملک میں بے حیائی اور فحاشی کا دور دورہ ہے مغربی یلغار نے پوری قوم کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ اور ان کے دلوں میں اس بے حیائی، فحاشی مغربی یلغار اور برائی کو ختم کرنے کا جذبہ بھی پیدا کر دیا تھا۔ اپنے حلقہ احباب

اور اہل علاقہ کے تعاون سے چند تبلیغی جماعتیں بھی قائم کر دیں جو جگہ جگہ جا کر لوگوں کو دین کی تعلیم دیتی۔ بے حیائی کو ختم کرنے اور شریعت کی پابندی کا حکم سناتی۔ انہیں ان تبلیغی جماعتوں سے کافی کامیابی نصیب ہوئی۔ یہاں اب شریعت پر سختی سے عمل بھی کیا جانے لگا تھا۔ مگر ابھی بھی اُن میں مکمل طور پر دین کی اصل روح بیدار کرنے کی ضرورت باقی تھی اس کے لیے انہوں نے نیا لائحہ عمل تیار کیا جس کے بارے بات کرنے کے لیے قاری صاحب اورنگ زیب کے پاس جا رہے تھے۔ ارادہ تو فجر کی نماز کے فوراً بعد جانے کا تھا۔ مگر غنودگی چھا گئی اور وہ کچھ دیر کے لیے ستانے کا سوچ کے لیٹ گئے۔ جب آنکھ کھلی تو کافی دن چڑھ آیا تھا۔ مدرسے کی خیر خبر لینا بھی ضروری تھا لہٰذا پہلے تو انہوں نے کلاسوں کا معائنہ کیا اور اُس کے بعد ہاتھ میں تسبیح پکڑے اورنگ زیب کی حویلی کو چل دیے۔

راستے میں انہیں جو بھی ملتا آگے بڑھ کر سلام کے لیے ہاتھ بڑھاتا۔ خیر و عافیت دریافت کرتے اور آگے چل دیتے۔ ہر ملنے والا اُن کی ہمدردی، دین کے لیے خدمت، شریعت پر پابندی کے لیے کوششوں، اخلاق، مخلصانہ پن اور ہمت و جرأت کی داد دیے بغیر نہ رہتا۔ وہ یہ سن کر عاجزی سے سر جھکا لیتے ان کے جذبے کا شکریہ ادا کرتے اور آگے چل دیتے۔ ان کی آمد پر اورنگ زیب بہت خوش ہوا۔ اور کھڑے ہو کر ان کا باقاعدہ استقبال کیا۔ قاری صاحب کی یہ کوئی پہلی یا دوسری ملاقات نہ تھی مگر اس کے باوجود کہ وہ کئی بار مل چکے تھے، ان کے جذبے میں کمی نہ آئی بلکہ اورنگ زیب نے انہیں پہلے سے زیادہ عزت و مقام دینا شروع کر دیا۔ ہر بار وہ ان کا پرتپاک استقبال کرتا۔ اورنگ زیب کو آج قاری صاحب کے چہرے پر اُداسی سی محسوس ہوئی مگر انہوں نے پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ سوچا وہ خود ہی بتا دینگے۔ خاطر مدارت کے بعد اس سے رہا نہ گیا تو کہنے لگا۔

"قاری صاحب آج تم ہم کو اُداس لگتا ہے...... کیا بات ہے؟"

قاری صاحب نے اپنی اُداسی بیان کی۔

"ہم ملک کی حالت دیکھ کر اُداس ہے............"

اورنگ زیب کو تجسس ہوا۔

"کیا ہوا ہمارا ملک کی حالت کو؟"

قاری صاحب کو غصہ آ گیا۔ "کیا ہوا؟ پوچھو کیا نہیں ہوا؟...... تم کو اپنے اردگرد کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ فحاشی، بے حیائی اور بدکاری کیا یہ اُداس ہونے کا واسطے کم ہے؟...... کہیں بھی شریعت پر پابندی نہیں ہو رہا...... ہم نے اور آپ نے مل کے جو تھوڑا بہت کوشش کیا اس سے کام بنتا نظر نہیں آتا......"

اورنگ زیب نے قاری صاحب کی باتوں کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"آپ ٹھیک کہتا ہے...... مگر ہم کیا کر سکتا ہے؟"

قاری صاحب آگ بگولہ ہو گئے۔ "کیا کر سکتا ہے؟...... اورنگ زیب ہم کو یہ بات سن کر بہت دُکھ ہوا......"

"تو کیا ہم نے غلط بات کیا؟"

''ہاں بالکل غلط بات......تم سب کچھ کرسکتا ہے مگر تمہارے اندر ہمت نہیں حوصلہ نہیں......''

اورنگ زیب اب طیش میں آ گیا۔ ''یہ غلط بات ہے ہمارے اندر حوصلہ بھی ہے اور ہمت بھی......آپ ہم کو بتاؤ ہم کیا کرے؟''

''جہاد......تم جہاد کرو''

''جہاد......''

''ہاں جہاد......'' قاری صاحب نے کہا

''مگر کس کے خلاف......؟'' اورنگ زیب نے سوال کیا

قاری صاحب سمجھانے لگے۔

''تم برائی...... بے حیائی اور فحاشی کو روکنے کے واسطے لڑو حدیث مبارکہ ہے۔

''جس نے جہاد نہ کیا وہ مر گیا یا اس کا موقع آیا مگر اس نے جہاد کا تیاری نہ کیا اور وہ مر گیا، تیاری کے وسائل تھے مگر اس نے جہاد آرزو اور تمنا بھی دل میں نہ رکھی اور وہ مر گیا۔ یوں سمجھو وہ جاہلیت کی موت مرا (یعنی کافروں کی موت)''

اگر تم نے بھی جہاد نہ کیا تو تم بھی کافر کی موت مرے گا۔ کیونکہ وقت آ گیا ہے۔''

اورنگ زیب ایک دم گھبرا گیا۔

''ہم اتنا پڑھا لکھا نہیں اور اتنا علم بھی ہمارا پاس نہیں جتنا آپ کا پاس ہے......مگر اب ہم جان گیا ہے کہ ہم کو لڑنا ہوگا......''

قاری صاحب نے کہا۔ ''بس تم تیار ہو جاؤ......کسی بات کا فکر مت کرو......''

اورنگ زیب بولا ''ہم کو کسی بات کا فکر نہیں......''

''ہمارا مطلب ہے روپے پیسے کا......روپے پیسہ ہم لگائے گا اسلحہ ہم دے گا بس تم لوگوں کو تیار کرے گا......اس نیک کام کا واسطے ہم تم کو اتنا پیسہ دے گا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتا......ہم چاہتا ہے دین کا خدمت کرے......اللہ کے سامنے سرخرو ہو......کیونکہ ہم اس کے سامنے قیامت کے روز اس بارے جوابدہ ہوگا......''

''قاری صاحب ہم تمہارے ساتھ ہے......''

''اب ہم کو یہ بات باقی لوگوں کو بھی سمجھانا ہے......''

''ہم سمجھائے گا......اس کے واسطے آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا......''

''ہم ضرور چلے گا......''

قاری صاحب اور اورنگ زیب نے باقاعدہ مہم کا آغاز کر دیا۔ سب سے پہلے تو وہ ارد گرد کے علاقوں کے بڑے بڑے سرداروں کے پاس گئے۔ ہر کسی سے جا کر جہاد کے بارے کہتے انہیں آیت و حدیث کا حوالہ دیتے۔ قاری صاحب حدیث مبارکہ بیان فرماتے ہوئے کہنے لگے۔

''اللہ تعالیٰ کے لیے جہاد کرنے والا کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص دن کا روزہ رکھتا ہے اور رات بھر تہجد اور تلاوت قرآن پاک میں مشغول رہتا ہے نہ کسی دن روزے میں سستی کرے اور نہ کسی رات نماز میں، مجاہد کا یہ فضیلت گھر واپس آنے تک رہتا ہے......''

سردار صاحب سبحان اللہ کہہ اُٹھے اور فوراً سے ہاتھ بڑھا دیا۔ دوستی کا، ساتھ دینے کا، رفتہ رفتہ بہت سے سرداروں نے ان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کے کارِ خیر میں شرکت اختیار کر لی۔ جب قاری صاحب نے حویلی میں جمع افراد کے سامنے ایک آیت مبارکہ کا ترجمہ سنایا۔

''اللہ نے اپنے مالوں اور جانوں سے اپنی راہ میں لڑنے والوں کا درجہ واجر ان لوگوں پر بڑھا دیا ہے جو گھروں میں بیٹھے رہے۔''

تو سب نے اللہ اکبر کا پر شگاف نعرہ بلند کیا۔ اور ان کی ہر طرح سے مدد کا اعلان کیا۔ قاری صاحب کے حامیوں میں اورنگ زیب کے علاوہ بہت سے دوسرے افراد شامل ہو چکے تھے وہ بھی اورنگ زیب کے ہم اثر افراد ہی تھے۔ ان کی حمایت کے بعد قاری صاحب نے اپنے مشن میں مزید افراد کو شامل کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ یہ جانتے تھے یہ اورنگ زیب جیسے لوگ تبلیغی عمل تک ان کا ساتھ دینگے مگر جان کی قربانی کے لیے اور قسم کے افراد کی ضرورت ہوگی۔ ان کی مدد کے بغیر مشن مکمل نہیں ہو سکتا۔ اپنے حجرے میں بیٹھے وہ اسی کے بارے سوچتے اور خود سے کہتے۔

''اورنگ زیب اور اس جیسے لوگ ہم کو مدد دے گا اُن لوگوں کو اکٹھا کرنے میں جو جان کا قربانی دے سکے گا...... اس لیے ان کا حمایت ضروری تھا...... تم نے غلط فیصلہ نہیں کیا......''

اب وہ ایک تجویز کے ساتھ اُن سب کے پاس گئے۔

''اگر آپ اپنا اپنا علاقہ میں تبلیغی عمل شروع کرے گا تو بہت سا لوگ اکٹھا ہو جائے گا......''

سب نے تجویز کی حامی بھر لی۔ قاری صاحب نے اس کے واسطے ان کی مالی معاونت کی یقین دہانی کروائی اور ایڈوانس میں کچھ رقم بھی ادا کر دی۔ اب ہر ایک نے اپنے اپنے علاقے میں تبلیغی عمل شروع کر دیا۔ وہ اپنے بندوں کو گلی کوچوں میں بھیجتے۔ جو لوگوں کو گھروں سے نکلنے کا درس دیتے اللہ کی راہ میں لڑنے، برائی، فحاشی اور بے حیائی کے لیے جان کی قربانی پیش کرنے کو اکساتے اور اس عذاب سے ڈراتے جو جہاد نہ کرنے کی صورت میں اُن پر نازل ہو سکتا ہے۔ کچھ لوگ ان کی باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتے تو کچھ کان لگا کے ان کی باتوں کو سنتے۔ انہوں نے لوگوں کو بتایا کہ مومن کی شان جہاد میں ہے۔

''مومن وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر انہوں نے شک نہ کیا اور اللہ کی راہ میں مالوں اور جانوں سے جہاد کیا سچے لوگ ہیں۔''

ان کی تعلیمات کے نتیجے میں بہت سے نوجوانوں نے رضا الٰہی، دین کی سربلندی، شریعت کے نفاذ، بے حیائی، فحاشی کے خاتمے اور جنت کے حصول کے لیے ان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو شامل کرنے کے لیے ان کی مالی مدد بھی کی جانے لگی۔ کچھ نوجوان تو محض خاندان کی خوشحالی کے لیے اس جماعت کا حصہ بننے لگے۔ بے روزگاری کو ختم کرنے کے لیے اس سے اچھا موقعہ انہیں نظر نہ آیا۔ اورنگ زیب نے زیادہ سے زیادہ مالی مدد حاصل کرنے کے لیے بچوں کو اُٹھوانا بھی شروع کر دیا۔ دولت کے نشے میں وہ مقصد کہیں دفن ہو گیا جس کے تحت اس نے

قاری صاحب کا ساتھ دینے کی حامی بھری تھی۔

اِدھر اورنگ زیب اور اس کے بندے لگے ہوئے تھے تو اُدھر قاری صاحب بھی سرگرم عمل تھے۔ ان کے مدرسے میں اب والدین کے علاوہ دوسرے لوگوں کا بھی آنا جانا ہونے لگا۔ ان میں گل خان اور سیف الرحمٰن بھی شامل تھے۔ وہ تقریباً روز ان کے پاس آتے کچھ وقت گزارتے اور چلے جاتے قاری صاحب کے راہ ورسم بڑھے تو بے تکلفی بھی بڑھی۔ اور ایک دوسرے کی ضرورت کھل کر بیان ہونے لگی۔ قاری صاحب کے مراسم گل خان اور سیف الرحمٰن سے کافی پرانے تھے مگر لوگوں کے سامنے اب آئے تھے۔ اور وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ بھی ان کی طرح ان کے پاس اپنے مسائل کے حل اور ان کے حسنِ اخلاق کی وجہ سے آئے ہیں۔ وہ لوگوں کے لیے اجنبی ضرور تھے مگر اس سوچ نے انہیں اجنبی نہ رہنے دیا۔

گل خان نے عرض کیا۔

”قاری صاحب ہم آپ کو لینے کا واسطے آیا ہے......“

قاری صاحب نے بغیر وجہ دریافت کیے حامی بھرلی

”کیوں نہیں ہم ضرور چلے گا؟ تم جب جب بلواؤ گے ہم چلے گا۔“

سیف الرحمٰن نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

”ہمارا لائق کوئی خدمت......“

قاری صاحب نے کہا۔

”خدمت تو ہم ضرور لے گا بس چند دن انتظار کرو......“

دونوں نے اپنی خوش قسمتی کا اظہار کیا۔

”آپ کب ہم کو یہ سعادت دے گا......“

”بہت جلد......“

پھر وہ دونوں وہاں سے چلے آئے...... جوں ہی اورنگ زیب کے پاس لوگ جمع ہوئے اس نے ان کی تربیت کا عمل شروع کر دیا۔ قاری صاحب نے اُس کو بن مانگے بہت سا اسلحہ فراہم کر دیا۔ ان کی کچھ تربیت یہاں کی گئی۔ اس کے بعد قاری صاحب نے ان افراد کو اپنے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا جس کو اورنگ زیب نے بخوشی قبول کر لیا اور اگلے ہی روز ایک گاڑی آئی اور وہ اورنگ زیب کے ٹریننگ سنٹر سے نئے سنٹر پر پہنچ گئے۔

اُن کے پہنچنے سے قبل قاری صاحب وہاں موجود تھے۔ ان کی آمد پر اُن کو خوش آمدید کہا گیا۔

ان کی آمد سے قبل قاری صاحب نے گل خان اور سیف الرحمٰن کو ان کے بارے سب کچھ بتا دیا بلکہ انہوں نے ہی اُنہیں لانے کے لیے گاڑی روانہ کی تھی۔ اب انہیں اُن نوجوانوں کے ساتھ ٹھہرایا گیا جو پہلے سے یہاں ٹریننگ کر رہے تھے۔ قاری صاحب کو ایک دو روز یہاں قیام کرنا تھا۔ پہلے دن تو انہوں نے آرام کیا اگلے روز سب کو اکٹھا کیا گیا۔ اکٹھے ہونے والے تمام لڑکے چودہ سال سے بیس بائیس سال کے لگ بھگ تھے۔ ان سب کو جہاد کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔ اور یہاں ان کو خاص طور پر جسمانی تربیت دی جاتی تھی۔ مگر جس مقصد کے لیے وہ اپنی جانوں کا نذرانہ پیش

کرنے جارہے تھے اس کے بارے جاننا بھی اشد ضروری تھا۔ یہاں آنے سے قبل اُنہیں اس مقصد کے بارے تعلیم تو ضروری جاتی تھی مگر یہاں بھی وقفے وقفے سے یہ عمل جاری تھا اور اسی سلسلے میں قاری صاحب یہاں آئے تھے۔ جب سب اکٹھے ہو گئے تو قاری صاحب کو بات کرنے کی دعوت دی گئی۔ سب سے پہلے قرآن پاک کی تلاوت کی گئی اور اس کے بعد قاری صاحب نے اپنی بات کا آغاز کیا۔

''آپ کا ملک میں بے حیائی اور فحاشی نے جگہ لے لیا ہے۔ اس کی روک تھام ضروری ہے۔ اور اس مقصد کے لیے ہم آپ کو تیار کر رہا ہے۔ تم ایک نیک مقصد کے لیے جدوجہد کر رہا ہے...... سورۃ انفال کی آیت نمبر 74 میں اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا کو حقیقی مومن کہا گیا۔ ان کے لیے مغفرت ہے اور انہیں عزت کا روزی عطا کیا جائے گا......''

دنیا کا زندگی عارضی ہے آخرت کا ابدی زندگی کا انتخاب کرو...... تم یہ جان لو کہ ایک شہید کبھی مر نہیں سکتا...... اگر تم لڑتے ہوئے اللہ کا راہ میں مر گے تو یاد رکھو...... اللہ نے فرمایا ہے۔

''جو لوگ اللہ کا راہ میں مارا جائیں اُنہیں ہرگز مردہ نہ سمجھو...... وہ حقیقت میں زندہ ہے اور رب کی طرف سے انہیں روزی ملتا ہے......''

اللہ کا راہ میں مرنے والا حقیقت میں زندہ رہتا ہے۔ مگر اس بات کا شعور نہیں سورۃ الصف کی آیت نمبر 11 میں جان و مال سے جہاد کے بارے میں فرمان ہے۔

''یہ تمہارا لیے خیر ہے اللہ تمہارا گناہ معاف کر دے گا۔ تم کو جنت میں داخل کرے گا۔''

قرآن پاک کا ان آیات میں جنت کا خوشخبری بھی ہے اور حیات جاوداں کا بھی۔ ایک شہید کا واسطے اس سے بڑھ کر کیا اعزاز و فضیلت ہوگا...... کہ اس کا متعلق یہ گمان بھی نہ کیا جائے کہ وہ مردہ ہے......

آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔

''دو آنکھوں کو آگ نہیں چھوئے گا ایک وہ جو اللہ تعالیٰ کا خوف سے روئے اور دوسرا جو اللہ تعالیٰ کا راہ میں پہرہ دیتے رات گزار دے۔''

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

''جنت تلواروں کا سائے تلے''

''جہاد کا واسطے اللہ تعالیٰ کا راستہ میں صبح و شام نکلنا دنیا اور اس کا تمام دولتوں اور نعمتوں سے بہتر ہے۔''

اس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ...... جہاد کی فضیلت کتنا ہے...... اس کا کتنا بلند مقام ہے...... جو چیز جتنا اہم ہوتا ہے اس کو اختیار کرنے کا اتنا ہی تاکید کیا جاتا ہے...... جہاد میں جان کا بازی لگانے والے کو بہت فضیلت حاصل ہے...... ہر طرف فحاشی و عریانی پھیلا ہوا ہے...... اس کا سدِ باب ضروری ہے...... جسم اللہ کا دیا ہوا نعمت ہے اس کو اس کا دین کے واسطے قربان کر دو۔''

سب نے قاری صاحب کی باتوں کو بہت غور سے سنا ان کی ایک ایک بات ان کے دلوں پر اثر کر رہی تھی۔ سب نے نعرہ تکبیر بلند کیا۔

جانیں قربان کرنے کا عہد کیا۔ اسلام کی سربلندی کا وعدہ کیا۔ کافی دیر فضا میں نعرہ تکبیر بلند ہوتا رہا۔ اور پھر قاری صاحب نے اجازت چاہی اور وہاں سے رخصت ہو گئے ان کے رخصت ہوتے ہی محفل برخاست ہو گئی اور سب اپنے اپنے مقام پر چلے آئے۔



آمنہ نے بہت سوچا ملک کی موجودہ صورت حال پر غور و غوض کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اس کی وجہ غربت، بے روزگاری اور دین کی تعلیمات سے لاعلمی ہے۔ جہاد کے نام پر جو لوگ بے گناہوں کو مار رہے تھے وہ شاید اس کی اصل روح سے واقف نہ تھے۔ اس لیے اُس نے پہلے خود اسلام کے بارے پڑھنے کا فیصلہ کیا اور پھر لوگوں کو اسلام کی اصل روح سے آگاہ کرنے کا سوچا۔ عامر اور رفعت نے بھی اس کی اس بات سے اتفاق کیا۔

اب اس نے لائبریری جوائن کر لی۔ وہ صبح دس بجے کے قریب گھر سے نکل پڑتی اور جب تک ہمت ساتھ دیتی لائبریری میں پڑی کتابوں کا مطالعہ کرتی۔ اس کی توجہ کا مرکز ہر وہ کتاب تھی جس میں اسلام کے بارے لکھا تھا۔ وہ یہ جاننے کو بے چین تھی کہ کیا اسلام وہ ہے جو لوگوں کو بتایا جاتا ہے یا اسلام وہ ہے جو اس کی سمجھ میں آتا ہے۔ اس کے لیے اُس نے ہر رائٹر کو پڑھنے کا فیصلہ کر لیا اُس کی خواہش تھی کہ وہ سب سے پہلے آپ ﷺ کی حیات طیبہ کے بارے پڑھے۔ آپ ﷺ کی حیات طیبہ پر لکھی گئیں وہ سب کتابیں لائبریری سے ایشو کروانے لگی جو وہاں موجود تھیں۔ اس نے مولانا شبلی نعمانی کی ''سیرت نبوی ﷺ'' ایشو کروائی اور لائبریری ٹیبل پر بیٹھ کے پڑھنے لگی۔

وہ اس کتاب میں اس قدر کھو چکی تھی کہ اُسے اپنے گرد و پیش کی بھی ہوش نہ رہی۔ سامنے والی ٹیبل پہ بیٹھا لڑکا اُسے کافی دیر سے دیکھ رہا تھا۔ مگر اُسے تو اس کی کچھ خبر نہ تھی۔ آمنہ کو یوں بیٹھے تقریباً دو تین گھنٹے گزر گئے۔ اچانک گردن کو ریلکس کرنے کے لیے سر اونچا کیا تو نظر اُس پر پڑ گئی مگر اس نے جلدی سے آنکھیں ادھر اُدھر گھمانا شروع کر دیں۔ آمنہ نے بھی اُسے اپنی غلط فہمی ہی سمجھا۔ اور کچھ دیر گردن کو آرام دینے کے بعد دوبارہ مطالعہ کرنے لگی۔ اس دوران اُس نے نوٹ کیا کہ وہ بار بار اُسے دیکھ رہا ہے۔ مگر جب وہ اُسے دیکھتی وہ نظریں چرا لیتا اور جب وہ لاعلمی کا اظہار کرتی تو وہ اُسے دیکھنے لگتا۔

اب جب اُس نے دوبارہ مطالعہ شروع کیا تو اس نے پھر نوٹس کیا۔ اب اسے ڈسٹربنس محسوس ہوئی اور وہ کتاب لیے گھر آ گئی۔ کئی روز اُس کے ساتھ ایسا ہی ہوتا رہا۔ آمنہ نے پہلے تو اسے برداشت کیا مگر تھک ہار کے اپنی ٹیبل بدل لی۔ اُس نے ایسا اس کے لائبریری میں آنے سے قبل کر لیا۔ اس لیے وہ لائبریری میں آ کر اپنی سیٹ پر بیٹھا تو سامنے اسے نہ پا کے پریشان ہو گیا۔ اور اُسے ڈھونڈنے لگا۔ اُسے کافی کھپنا پڑا۔ کیونکہ لائبریری کافی بڑی تھی اور آمنہ بیٹھی بھی ایک ایسے کونے میں ہوئی تھی۔ جہاں انسان سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ مگر اُس نے آخر کار اُسے ڈھونڈ ہی لیا۔ آمنہ اب بھی مطالعے میں ایسی غرق ہوئی تھی کہ اُسے پتہ بھی نہ چلا کہ جس شخص کی نظروں سے بچ کر بیٹھنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اُسے تنگ نہ کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ اُسے بالکل مختلف دکھائی دی تھی۔ اور اُسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگر وہ اس کی حرکت سے تنگ آ گئی تو کہیں گم ہو جائے گی۔ اب وہ ایک ایسی ٹیبل پر بیٹھا تھا جہاں سے وہ تو آمنہ کو دیکھ سکتا تھا مگر وہ اُس کی نظروں سے اوجھل تھا۔

جب تک آمنہ لائبریری میں رہتی وہ کتاب سامنے رکھے اُسے دیکھتا رہتا۔ اُسے اس کی یہ بے خبری بہت بھانے لگی۔ اُس کا جی چاہتا کہ وہ یوں ہی کتابوں میں ڈوبی رہی اور وہ اُسے دیکھتا رہے۔

وہ لائبریری آیا تو کسی اور مقصد کو تھا مگر اب اس کے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ ایک روز آمنہ مطالعہ کرتے ہوئے رونے لگی۔ اُسے اس حالت میں دیکھ کر وہ بے چین ہوگیا۔ وہ اس کے رونے کی وجہ جاننا چاہتا تھا مگر وہ اُسے خود کے سامنے شرمندہ ہونے سے بھی بچانا چاہتا تھا۔ جب تک وہ وہاں بیٹھی رہی وہ اُس کے رونے کے سبب کے بارے سوچتا رہا اس کے آنسوؤں نے اُسے اداس کرنے کے ساتھ پریشان بھی کردیا۔ مگر اس کی مجبوری یہ تھی کہ وہ اس کے پاس نہ جا پا رہا تھا۔

جب وہ بیگ اُٹھائے لائبریری سے باہر آئی تو وہ بھی اس کے پیچھے آ گیا۔ جب آمنہ نے گاڑی کا دروازہ کھولا تو وہ اس کے قریب تر ہونے کے باوجود آگے بڑھ کے اس سے اس کے دُکھ کے بارے نہ جان سکا۔ وہ وہی کا وہی کھڑا رہا اور وہ چلی گئی۔

جب وہ گھر پہنچی تو اس کی بھیگی آنکھوں نے رفعت کو ایک بار پھر پریشان کردیا۔ وہ گھر آ کے سیدھی اپنے کمرے میں چلی آئی اور دروازے کو اندر سے لاک کرلیا۔ دبے دبے آنسو نے اب کُھل کر برسنا شروع کردیا۔ رفعت بھی اس کے پیچھے پیچھے آئی دروازے پر خوب دستک دی مگر اُس نے اس وقت تک دروازہ نہ کھولا جب تک اس کے دل کا غبار نہ نکل گیا۔ رفعت کے دل میں عجیب عجیب سے خیالات اُٹھ رہے تھے۔ جلدی سے بیٹے کے کمرے میں آئی اور اسے آمنہ کی حالت کے بارے بتایا۔ وہ بھی پریشان ہوگیا اور دوڑا دوڑا اس کے کمرے کے پاس آیا۔ دروازے کو پیٹا۔ آمنہ نے دروازہ کھول دیا۔

اُسے زندہ وسلامت دیکھ کر اُن دونوں نے سکھ کا سانس لیا۔ رفعت نے پرنم آنکھوں سے کہا۔

"بیٹی تم نے تو ہمیں ڈرا ہی دیا تھا...... اگر خدانخواستہ تمہیں کچھ ہوجاتا تو قیامت کے روز ہم تیری ماں کو کیا جواب دیتے......"

عامر نے غصے سے کہا۔

"آمنہ آئندہ ایسی حرکت مت کرنا......"



آصف اوراس کے دوستوں نے گھومنے پھرنے کا پروگرام بنایا۔اس بات کے باوجود کے باہر حالات خراب ہیں جگہ جگہ موت ڈیرا ڈالے بیٹھی ہے۔گلی کوچوں میں خوف وہراس چھایا ہوا۔پُر ہجوم جگہ خیریت وعافیت کے لیے دُعا گو ہے۔ہر شخص چاہے وہ پیدل ہو یا سوار خود کو زندگی کا مہمان سمجھ کے چل رہا ہے۔گھر زندہ سلامت لوٹ کے جانے کی اُمید کسی کو نہیں۔

کار میں بیٹھے وہ سڑکوں کی خاک چھان رہے تھے۔فضا میں پھیلے ماتم کو محسوس کرتے چلے جا رہے تھے کار فراٹے بھرتی دور نکل آئی شہر سے کافی دور۔اگر چہ وہ اوروں کی طرح غمزدہ نہ تھے مگر فضا کے ماتم نے اُنہیں دُکھی کر دیا۔

اجمل نے اس کیفیت کو ختم کرنے کے لیے تجویز پیش کی۔"یار آصف ٹیپ آن کرو۔"

کاشف نے فوراً ٹوک دیا"یار تم بھی کبھی کبھی عجیب باتیں کرتے ہو......اتنے ٹینس ماحول میں تمہیں گانے بجانے کی سوجھ رہی ہے۔"

آصف نے کہا۔"یار کاشف ٹھیک ہی کہہ رہا ہے......"

اجمل نے جب دیکھا کہ یہ تجویز کارگر نہیں ہوئی تو ان کے چہروں پر مسکراہٹ بکھیرنے کے لیے بولا۔

"یار تم دونوں سچ کہتے ہو اگر کسی طالبان نے ہماری ٹیپ کی آواز سن لی تو آج ہمیں زندگی سے ہاتھ دھونا پڑ جائینگے۔"

اب تو وہ بے اختیار ہنس دیے۔

کاشف بولا۔"یار تم ٹھیک کہتے ہو......"

وہ اِدھر اُدھر کی ہانکتے جا رہے تھے کہ اچانک اُنہیں ایک تیرہ چودہ سال کا بچہ نظر آیا۔جو ہاتھ کے اشارے سے ان کی گاڑی کو روک رہا تھا۔

انہوں نے یہ سوچ کے گاڑی روک دی کہ بے چارا بس اسٹاپ تک پیدل کیسے جائے گا......کیونکہ بس سٹاپ کافی دور تھا۔

آصف نے پوچھا۔"جی بیٹا......"

وہ بولا"صاحب ہم کو بس سٹاپ تک چھوڑ دو گے......"

اجمل نے فوراً کہا۔"آؤ بیٹھو......"

اجمل اور کاشف نے اُسے اپنے پاس بٹھا لیا۔وہ خوبصورت تھا۔اس لیے اُنہیں اُس پہ پیار آ گیا۔اجمل نے اس سے اس کا نام پوچھا تو اُسے جواب دیا۔

"ہمارا نام بہادر ہے......بہادر......"

کاشف اس کا نام سن کر حیران ہوا۔

"بہادر......تمہارا یہ نام کس نے رکھا ہے؟"

اُس نے بے دھڑک ہو کر جواب دیا۔"ہمارے کمانڈر نے......"

کمانڈر لفظ سننا تھا کہ وہ تینوں گھبرا گئے۔مگر اپنے اندر کے وسوسوں کو دور کرنے کے لیے کاشف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم اپنے ابو کو کمانڈر بولتے ہو......''

اُس نے جواب دیا۔''نہیں......''

یہ سنتے ہی ان کے چہرے کی ہوائیاں اُڑ گئیں۔کمانڈر نام کی ایسوی ایشن کے بارے سوچتے ہی ان کے رنگ پھیکے پڑ گئے۔اور اس سے پہلے کہ وہ اُسے گاڑی سے اُترنے کو کہتے وہ بولا۔

''چپ چاپ گاڑی چلاؤ......اور جب تک میں نہ کہوں رکنا مت......ورنہ دھماکے سے تمہاری گاڑی کو اُڑا دونگا۔''

اب تو ان کو جان کے لالے پڑ گئے۔ان کی جان پر بن گئی اور دل میں کہنے لگے کہ یہ آفت کہاں سے نازل ہوگئی ہے۔وہ ایک دوسرے کو یوں گھور رہے تھے جیسے کہہ رہے ہو تم کھا لو ترس۔اب اس ترس کا نتیجہ بھی بھگتنا۔وہ اب نہ گھر کے رہے تھے اور نہ گھاٹ کے۔آگے کنواں تھا تو پیچھے کھائی اگر اُسے اترنے کا کہتے ہیں بہت سے لوگوں کو جانوں سے ہاتھ دھونا پڑتے ہیں اور اگر اُسے ساتھ لیے یوں ہی چلتے جاتے ہیں تو ان کی خیر نہ تھی۔اب تو سب قسمت پر چھوڑنے کے کوئی چارہ نہ تھا۔آصف چپ چاپ گاڑی چلا رہا تھا۔وہ تینوں اس چھوٹے سے بچے کے ہاتھ کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔اس کے ہاتھ میں ان کی باگیں تھیں۔وہ جس طرف اُنہیں موڑتا وہ مڑ جاتے۔اب سوائے موت کا انتظار کرنے کے کوئی راستہ نہ تھا۔

اجمل نے یہ سوچ کر اس سے سوال پوچھ ڈالا کہ مرنا تو ہے تو کیوں نہ کوئی معلومات ہی حاصل کر لی جائے۔

''تمہیں موت سے ڈر نہیں لگتا......''

وہ جھٹ سے بولا۔ ''نہیں......اب نہیں......''

اس نے دوبارہ سوال کر ڈالا۔''کیا مطلب اب نہیں؟''

بہادر نے جواب دیا۔''جب ہم کو اغوا کیا گیا تو تب بہت لگتا تھا مگر اب تو ہم ٹرینڈ ہوگیا ہے......ٹریننگ نے سب خوف ختم کر دیا ہے۔''

اجمل کو اس کی باتیں دلچسپ لگنے لگیں اب اس نے اس سے پوچھا۔

''صرف ٹریننگ نے تمہیں نڈر بنا دیا......اس میں ایسی کیا خاص بات تھی؟''

بہادر نے غصے سے کہا۔ ''صرف ٹریننگ نے نہیں بلکہ اس خوشخبری نے بھی کہ ہم مرنے کے بعد سیدھا جنت میں جائے گا...... اس تھوڑا سا زندگی کا سودا بہت لمبی زندگی کا خاطر کرنا کیا کوئی گھاٹے کا سودا ہے......ساری عمر بھی نیکی کا کام کرو تو بھی جنت کا گارنٹی نہیں......مگر ایک شہید کو جنت ضرور ملتی ہے......گاڑی دائیں طرف موڑو......''

''پڑھے لکھے ہو......''

''پڑھتا تھا......مگر اب اس کا ضرورت نہیں ویسے بھی یہ بے کار ہے اصل علم تو میرے پاس ہے۔بائیں موڑو......''

وہ اس کے بے باک پن سے خوف زدہ تھے۔کاشف جو کافی دیر سے اس کی حرکات نوٹ کر رہا تھا اس کے جوابات سن رہا تھا اُس سے کہنے لگا۔

''جہاد کر رہے ہو......''

وہ طیش میں آ گیا۔ ''تو کیا تمہاری طرح جھک مار رہا ہوں......''

اب گاڑی میں مکمل خاموشی تھی۔ اور یہ کافی دیر طاری رہی مگر اجمل کو تو جیسے کھلبلی ہو رہی تھی کہنے لگا۔

''تمہیں بے گناہوں کو مارتے ڈر نہیں لگتا......افسوس نہیں ہوتا۔''

اس سوال پر وہ آگ بگولہ ہو گیا۔ ''ہرگز نہیں......ہم جہاد کر رہا ہے......اسلام کا خاطر لڑ رہا ہے اگر اس لڑائی میں ہمارا والدین یا بہن بھائی بھی آئے گا تو ہم اس کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرے گا......بائیں موڑو......''

بہادر سارا دن انہیں اپنے اشاروں پر گھوماتا رہا۔ کبھی گاڑی کو دائیں جانب موڑنے کا کہتا تو کبھی بائیں کبھی سیدھا چلنے کا حکم صادر کرتا اور جب گاڑی پر ہجوم جگہوں سے گزرتی تو سب اللہ سے سب کی خیر و عافیت کی دعا مانگنے لگتے۔ ہر ایسی جگہ پر ان کے دل دھڑکنے لگتے اور یہ دھچکا لگنے لگتا کہ کہیں یہی لوگ تو اس کا نشانہ نہیں اور جوں ہی وہ یہاں سے نکلتے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے۔ سینکڑوں لوگوں کی موت کے بارے میں سوچ بھی انہیں جھنجھوڑ دیتی۔ انہیں دن کے ڈھلنے کے ساتھ ساتھ اپنی موت کا تو یقین ہوا چلا تھا۔ مگر وہ اپنے علاوہ کسی کی بھی موت کے بارے سوچنا نہ چاہتے تھے۔ کئی گھنٹے گاڑی میں سکوت چھایا رہا اور آخر کاشف نے اُسے توڑا۔

''تمہارا نہیں خیال کہ ایک بھی بے گناہ انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے......''

اُس نے جواب دیا۔ ''میں ایسا نہیں سمجھتا......''

اجمل نے کہا۔ ''مگر ایسا ہے......ہم نے پڑھا ہے۔''

وہ خاموش ہو گیا وہ سمجھے اُس پر ان کی بات کا اثر ہوا ہے اس لیے اجمل نے مزید کچھ کہنا چاہا تو وہ بولا۔

''زندگی چاہیے یا نہیں......''

یہ سُن کر اجمل کی بولتی بند ہو گئی۔ کاشف کو بھی سانپ سونگھ گیا۔ آصف تو پہلے ہی بت بنا بیٹھا تھا۔ آخر جب شام ہو گئی تو وہ گاڑی کو ایک ویرانے میں لے آیا اور پھر وہاں اُتر گیا۔ ادھر وہ گاڑی سے اُترا اور اُدھر پلک جھپکتے غائب ہو گیا۔ آصف نے گاڑی فل سپیڈ پر چلانا شروع کر دیا۔ اور جب وہ اس ویرانے سے نکلے تو جہاں گاڑی کی سپیڈ سلو ہوئی وہاں خدا کا شکر ادا کیا کہ جان بچ گئی۔ کاشف اور اجمل کو ان کے گھروں پر ڈراپ کرنے کے بعد وہ گھر آ گیا۔ سیدھا کمرے میں گیا۔ اپنے کمرے کو دیکھ کر اُسے یقین ہوا کہ وہ زندہ سلامت لوٹا ہے ورنہ اب تک وہ خود کو موت کے رحم و کرم پہ پا رہا تھا۔ جب اس کی ماں کو اُس کی آمد کی خبر ہوئی تو فوراً اس کے کمرے میں آئی۔ اُسے گھبرایا گھبرایا دیکھ کر بولی۔

''سب خیریت تو ہے......''

وہ ماں کو کسی بھی قسم کی بات بتا کے پریشان نہ کرنا چاہتا تھا۔

''جی سب خیریت ہے............''

''میں کھانا لاؤں......''

''ابھی نہیں...... بلکہ آپ سو جائیں مجھے جب بھوک لگے گی میں کھالوں گا۔''

آصف نے آج سے پہلے کبھی اس قسم کی بات نہ کی تھی۔ اس بات نے اُسے پریشان کر دیا مگر آصف کے بار بار سمجھانے پر اس کی بات پر اعتبار کر لیا کہ سب ٹھیک ہے۔ جوں ہی ماں کمرے سے باہر نکلی فوراً وہ بچہ اور سارا منظر آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

اگلے روز وہ تینوں دوست کالج میں ہر ایک سے اس واقعہ کا تذکرہ کر رہے تھے۔ اس وقت تو وہ گھبرائے ہوئے تھے مگر آج اپنی اُس کیفیت کو سوچ کے خود ہی ہنس دیے۔ ہر ایک دوسرے کا مذاق اُڑانے لگا۔ مگر جب وہ اکیلے ہوئے تو سوچنے لگے۔ آخر وہ کون تھا؟ کون لوگ ہیں جو ان کو تیار کر رہے ہیں؟ کیا صرف اتنا بتا دینا کہ تمہیں جنت ملے گی سینکڑوں لوگوں کی جان لینے کے لیے کافی ہوتا ہے؟ کیا یہ کسی مجبوری کے تحت ایسا کرتے ہیں؟ ایسے بہت سے سوالات ان کے ذہنوں میں تھے۔ اور ان کے وہ جوابات چاہتے تھے۔ اس واقعہ نے آج پھر اُنہیں مولانا صاحب کی یاد دلا دی۔



آمنہ کئی دنوں سے لائبریری نہ آئی وہ ہر روز اس امید پر چلا آتا کہ آج وہ ضرور آئے گی۔ آ کر اُسی جگہ پہ بیٹھ جاتا جہاں وہ بیٹھا کرتا تھا مگر جب پندرہ بیس دن گزر جانے کے باوجود اس کا کوئی اتہ پتہ نہ چلا تو اس کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔ امید ٹوٹنے لگی۔ انتظار بڑھتا چلا گیا۔ مگر اس کے پاس سوائے انتظار کے کوئی راستہ بھی تو نہ تھا۔ کوئی اتہ پتہ ہوتا تو وہ جاتا مگر پھر یہ بھی سوچنے لگتا کہ اگر اُسے پتہ مل بھی جائے تو وہ کس حیثیت سے اس کے گھر جائے گا۔ اور پھر یہ خیال بھی ذہن میں اُبھر آتا کہ فرض کر و اس کے گھر چلا جاتا ہوں تو اُس کے سوالوں کا کیا جواب دوں گا۔ اگر وہ پوچھے گی کہ آپ کون ہے؟ اُس کے گھر کس لیے تشریف لائیں ہیں؟ آپ کی جرأت کیسی ہوئی؟ آپ میرے لگتے کون ہیں؟ وغیرہ وغیرہ اور اگر وہ ناراض ہو گئی اور یہاں آنا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ترک کر دیا تو پھر وہ کیا کرے گا؟ اس طرح کی بہت سی اور سوچوں نے ہمیشہ اُس کے قدم روک لیے۔ اور اُس نے اس کا اتہ پتہ لگانے کی کوشش تک نہ کی۔

بس ہر لمحہ یہی دعا کرتا کہ وہ خیریت سے ہو اور جلد از جلد پھر سے آنا شروع ہو۔

آمنہ سخت بیمار تھی۔ ہر وقت کمرے میں لیٹی رہتی۔ رفعت نے بہت ڈاکٹروں سے اس کا علاج کروایا مگر اس کی صحت بحال ہونے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ ہر وقت روتی رہتی نہ کچھ کھاتی نہ پیتی، بس کبھی کبھار دل زیادہ بے چین ہوتا تو لان میں آ کے بیٹھ جاتی۔ رفعت نے دن رات اس کی خدمت کی۔ اُسے تو ہوش تک نہ تھا کہ وہ کہاں پڑی ہے۔ اُس کی طبیعت کچھ سنبھلی تو رفعت اُسے لان میں لے آئی اور اس سے باتیں کرنے لگی۔ اُسے اداس دیکھ کر بولی۔

''بیٹی آخر تم بتاتی کیوں نہیں...... یوں روز روز بیمار ہونا تمہارے لیے خطرناک ہے...... اپنا دُکھ مجھ سے بانٹا کرو...... میں تمہاری ماں ہوں...... میں نے تو سکینہ کی زندگی میں بھی تمہیں اپنی ہی بیٹی سمجھا اور آج بھی سمجھتی ہوں...... تم شاید جانتی نہیں مجھے تمہیں اس حالت میں دیکھ کر کتنی تکلیف ہوتی ہے۔''

آمنہ کو رفعت کے دُکھ کا احساس تھا اس کی ان ساری باتوں نے اُسے دکھی کر دیا اور آنسو بے اختیار نکل کر اُس کی گالوں پر تیرنے لگے۔

''آنٹی مجھے احساس ہے میں خود بھی آپ کو تکلیف نہیں دینا چاہتی...... مگر میں کیا کروں؟''

آنسو بہے جا رہے تھے اور اُس سے مزید بات نہ ہو پائی تو خاموش ہو گئی رفعت نے اُس کی یہ جو حالت دیکھی تو شرمندہ سی ہوئی کہ اُس کی باتوں سے اس کی آنکھیں اشکبار ہوئیں ہیں۔ آگے بڑھ کر اُسے گلے لگا لیا۔

''بیٹی میرا مقصد تمہیں اذیت دینا نہ تھا......''

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی اور وہ دروازے پہ چلی آئی۔ آمنہ ان آنسوؤں کے ساتھ بہتی ہوئی دور نکل آئی۔

موسم بہار کی آمد کے ساتھ ہی بسنت کا شور پڑ گیا۔ آمنہ نے اس بار گھر پر بسنت منانے کی ضد کی۔ اسد نے بھی پہلے سے سوچ رکھا تھا کہ وہ اس تہوار کو گھر پر منائے گا۔ اس لیے اُسے عامر اور خرم کو پہلے ہی مدعو کر لیا۔ یہ دونوں اس کے بیسٹ فرینڈ تو تھے ہی ان کا اس کے گھر آنا جانا بھی بہت زیادہ تھا آمنہ اور سکینہ اُنہیں گھر کے فرد کی طرح ہی سمجھتی تھیں۔ اس لیے اُن کے آنے پر اُنہیں کوئی اعتراض نہ تھا۔ اگر اسد نے دوستوں کو مدعو کیا تھا تو آمنہ بھی پیچھے نہ رہی۔ اُس نے بھی اپنی ساری سہیلیوں کو انوائیٹ کر لیا۔

بسنت کا پروگرام رات کا تھا مگر آمنہ کی سہیلیاں صبح ہی اس کے گھر وارد ہو گئیں۔ سب نے مل کر مختلف ڈشیز تیار کیں۔ اور شام ہوتے ہی شور شرابے کے گونجنے کا انتظار کرنے لگیں۔ اور جوں ہی تھوڑی تھوڑی سی آوازیں گونجیں۔ اُنہوں نے بننا سنورنا شروع کر دیا۔ اور اسد کے آنے سے قبل چھت پہ آ گئیں۔ دن بھر کام کاج کے باوجود وہ ہشاش بشاش تھیں۔ اسد نے جوں ہی گھر میں قدم رکھا آمنہ کا پوچھا۔ اور پھر خرم اور عامر کے ساتھ چھت پہ آ گیا۔ چھت پر آ کر اُنہیں یوں لگا جیسے وہ کسی میلے میں آ گئے ہو۔ گانوں اور بوکاٹا کے شور نے میلے کا سماں باندھا ہوا تھا۔ آسمان پر اُڑتی رنگ برنگی پتنگوں نے اس میلے کو چار چاند لگا دیے۔ اسد کے آنے سے پہلے وہ سب چھپ گئیں۔ چھت پر آتے ہی وہ آمنہ کو آوازیں دینے لگا۔

''آمنہ...... آمنہ......''

اچانک سے جو وہ ان کے قریب آئے آمنہ نے اسد کو ڈرایا۔ اب وہ ان کے سامنے تھیں۔ اسد کی فوراً نظر صائمہ پر پڑی۔ پیلے رنگ کی شلوار قمیض میں ملبوس، ہاتھوں میں پھولوں کے گجرے، رنگ برنگی چوڑیاں، کانوں میں بُندے اور بالوں میں پھول سجائے وہ اُسے پری لگ رہی تھی۔ اُسے جو دیکھا تو نظریں اُس پر ہی جم گئیں سب اُسے دیکھ رہے تھے اور وہ صرف اُسے۔ صائمہ کی نظریں بھی اسد پہ لگی ہوئی تھیں مگر وہ اس کی طرح ارد گرد سے بے خبر نہ تھی۔ سب پہلے ہی اس موقع کی تاک میں تھے۔ ایک دوسرے کو یوں دیکھا جیسے کہہ رہے ہو جھپٹ پڑو......

آمنہ نے پہلا وار کیا۔

''عامر بھائی آج اسد بھائی کی خیر نہیں......''

سب ہنس دیے عامر نے جملہ کسا۔ ''بھائی یہ محبت چیز ہی ایسی ہوتی ہے اس کی موجودگی کسی اور چیز کا احساس ہی نہیں ہونے دیتی...... بندہ دوست تو کیا اپنا آپ بھی بھول جاتا ہے......''

خرم نے بھی تیر چلایا۔ ''یار مجنوں بیچارے کو کبھی کبھار تو بنی سنوری لیلیٰ نظر آتی ہے تو بیچارا کیا جی بھر کے دیدار بھی نہ کرے...... بنتا ہے بھائی بنتا ہے وہ کسی شاعر نے بھی خوب کہا ہے۔''

رسم دنیا بھی ہے موقعہ بھی ہے دستور بھی
سج دھج بھی ہے رنگ بھی ہے غرور بھی

سب خوب کھکھلا کے ہنسے۔ صائمہ نے اُسے جھنجھوڑا۔

''اسد...... اسد...... اِدھر اُدھر بھی دیکھ لو......''

اسد نے ایک دم ہوش میں آتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... ہاں...... کیا کہہ رہی ہو......''

عامر نے پھر سے فقرہ کسا۔'' دیکھو...... سنو...... صائمہ بھابھی کے کہے الفاظ تو سن لیے...... ہم بیچارے تو ہوا میں ہی تیر چلاتے رہ گئے...... '' بھابھی کا لفظ سن کر صائمہ شرما گئی۔

اسد نے جلدی سے موضوع ہی بدل ڈالا۔''یوں ہی چھیڑ چھاڑ میں وقت ضائع کرو گے یا پتنگ بازی کا بھی پروگرام ہے......''

آمنہ نے پوچھا۔''پتنگ بازی تو ضرور ہوگی...... پہلے خرم بھائی یہ تو بتائیں یہ دوسرا مصرعہ بھی کیا شاعر ہی کا تھا......''

عامر نے اس کی بات کا جواب دیا۔ ''ارے پگلی شاعر بھلا ایسا بے تکا مصرعہ کہہ سکتا ہے......''

آمنہ نے ہنستے ہوئے کہا۔''تو یہ خرم بھائی کا مصرعہ ہے...... خیر اتنا برا بھی نہ تھا۔ موقعہ کی مناسبت سے بالکل درست تھا۔''

اسد نے ایک بار پھر ان کے موضوع میں ٹانگ اَنکائی......''ارے یار ختم کرو اس شعر کی بحث کو...... چلو پتنگ بازی کریں......''

اب جو چھت پر شور شرابہ برپا ہوا تو رات گئے تک جاری رہا۔ ان کے شور سے تنگ آ کے سکینہ چھت پر آ گئی۔

''ارے بچوں ذرا ہمسائیوں ہی کا کچھ خیال کرلو......۔''

عامر نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''ارے آنٹی ذرا چند قدم آگے تو آئیں...... دیکھیں آپ کے ہمسائے بھی ہمارے شور میں برابر کے شریک ہیں۔''

سکینہ نے چند قدم آگے بڑھائے تو دیکھا کہ ہر طرف شور تھا بوکاٹا کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ چھتوں پر لڑکے بھنگڑا ڈال رہے تھے۔ ناچ گانا ہو رہا تھا۔ وہ تو یہ سمجھی تھی کہ اس کی چھت پہ ہی سب سے زیادہ ہنگامہ ہے مگر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اردگرد کے گھروں کی چھتوں پر ان سے زیادہ شور شرابہ کرنے والے موجود تھے۔ اب بیچاری انہیں کیا کہہ سکتی تھی۔ خاموشی سے نیچے اُتر آئی۔ اُن کے جانے کے بعد تو جیسے ان کے حوصلے اور بلند ہو گئے۔ وہ خوب کھل کے اپنی خوشی کا اظہار کرنے لگے۔ تینوں لڑکے پتنگ اُڑا رہے تھے اور لڑکیاں ان کا مورال بلند کرنے کو کھڑی تھیں۔ جوں ہی وہ کسی کی پتنگ کاٹتے باجا بجایا جاتا، بوکاٹا کی آوازیں بلند کی جاتیں۔ عامر خوشی سے ناچنے لگتا۔ اسد کی نظریں اب بھی پتنگ پر کم اور صائمہ پر زیادہ گڑی

ہوئی تھیں۔ وہ بھی سب سے نظر بچا کے اُسے دیکھنے لگتی اور پھر شرما جاتی۔ آمنہ کافی دیر سے اس سین کو دیکھ رہی تھی۔ مگر ابھی تک اس نے رنگ میں بھنگ ڈالنے کی کوشش نہ کی۔ آخر کب تک وہ خود کو روکتی۔ آخر اس کے دماغ میں ہل چل ہوئی اور بھائی کے قریب جا کے عجلت بھرے لہجے میں بولی۔

''اسد بھائی......آپ کی پتنگ......''

اسد بوکھلا گیا۔ جلدی سے نظریں صائمہ سے ہٹا کے پتنگ پر ڈالیں تو اُسے فضا میں لہراتا دیکھ کے بولا۔''بڑی تیز ہوگئی ہو......''

اُس نے بھی بڑا اترا کے جواب دیا۔ ''آخر بہن کس کی ہوں؟''

وہ بوکاٹا کی آوازیں بلند کر کے تھک چکی تھی۔ وہ خود پتنگ بازی کے موڈ میں تھی۔ اس لیے اس نے بھائی سے ضد کی کہ وہ اُسے بھی پتنگ اُڑانے کا موقعہ دے۔ وہ اس کے بالکل بھی حق میں نہ تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اُسے پتنگ بازی کی الف بے بھی معلوم نہیں۔ پھر ڈور بھی کافی تیز تھی اور اس کے کٹ لگنے کا اندیشہ بھی تھا۔ مگر وہ اپنی بات پر بضد تھی۔ آخر صائمہ کے کہنے پر وہ مان گیا۔ چند منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ اس کا اندیشہ درست ثابت ہوگیا۔ ڈور نے اس کے ہاتھ زخمی کر دیے۔ جب درد کا احساس ہوا تو وہ ہائے ہائے کی آوازیں نکالنے لگی۔ اسد بھاگ کر اس کے پاس گیا۔

''کیا ہوا؟''

''بھائی......ہاتھ زخمی ہوگئے......''

اسد نے جلدی سے ڈور اس کے ہاتھوں سے پکڑی اور پھر اُسے خرم کو تھماتے ہوئے اس کے ہاتھ دیکھے تو کافی کٹ لگ چکے تھے۔ درد آمنہ کو تھا مگر تکلیف اُسے بھی ہو رہی تھی۔ اُسے ڈانٹنے لگا۔

''کتنا منع کیا تھا مگر تم باز نہ آئی......اب دیکھ لیا نتیجہ......''

وہ رو رہی تھی۔ سب نے پتنگیں اور ڈوریں پھینکیں اور اس کے گرد جمع ہوگئے۔ سب کو فکر ہونے لگی۔ اسد کو جہاں ماں کی ڈانٹ کی فکر تھی تو وہاں آمنہ کے درد کا احساس بھی تھا۔

''اب امی مجھے نہیں چھوڑیں گی......''

آمنہ نے بھائی کو دلاسا دیا۔ ''میں امی کو سب سچ بتا دونگی......آپ فکر مت کریں۔''

اسد پھر سے اُسے ڈانٹنے لگا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے میں صرف امی کے ڈر کی وجہ سے پریشان ہوں؟......مجھے تمہارے درد کا احساس نہیں'

آمنہ اپنے کہے ہوئے الفاظ پر شرمندہ ہوئی۔ بھائی کی آنکھوں میں اپنے لیے پیار اور فکر دیکھ کر اپنا درد بھول گی۔ مسکرا کے کہنے لگی۔''

''میں ٹھیک ہوں......''

عامر نے ان کی توجہ ہٹانے کو کہا۔

''اسد اور آمنہ بے شک تم دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے ہو......مگر (منہ بناتے ہوئے بولا) افسوس صائمہ اس پیار کو قابل رشک نہ رہنے دے گی......''

آمنہ نے فٹ سے جواب دیا۔

''عامر بھائی آپ بڑے تیز ہیں...... مگر آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے۔ صائمہ مجھے بھائی سے زیادہ چاہتی ہے۔''

خرم نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''لو بھائی خرم تمہیں تو منہ کی کھانی پڑی ہے......''

سب ہنس دیے۔ اسد نے آمنہ کو گلے لگا لیا۔ وہ اُسی پیار کی شدت کو محسوس کر رہی تھی۔ عامر اور رفعت نے وہاں آ کر جب اس کا نام پکارا تو اُس نے خود کو وہاں پایا۔ وہ جان گئے تھے کہ وہ اس وقت کہاں کھوئی ہوئی تھی۔

''بیٹی حقیقتیں تلخ ضرور ہوتی ہیں مگر ان کو تسلیم کر لینے میں ہی ہماری بھلائی ہے......''

اس سے پہلے کہ ماحول سنجیدہ ہوتا عامر نے اس کا توڑ تلاش کر لیا۔

''میرے پاس آپ لوگوں کے لیے ایک خوشخبری ہے......''

وہ تو سوچ رہا تھا کہ آمنہ اس سے ضد کرے گی بے چین ہوگی مگر ایسا کوئی سین آن ہوتا اُسے نظر نہ آ رہا تھا۔ آخر اُس نے خود ہی کہا۔

''آمنہ تم بھی بہت بور ہو...... کوئی تجسس، بے چینی......''

وہ مسکرا دی۔ ''بھائی بتائیں...... کیا خوشخبری ہے؟''۔

''تو سنو...... مجھے سی۔آئی۔ڈی ڈیپارٹمنٹ میں جاب مل گئی ہے......''

اب تو وہ واقعی خوش ہوگئی۔ ''سچ بھائی......''

''تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟''

آمنہ اور رفعت نے خدا کا شکر ادا کیا۔

''بھائی اسی خوشی میں میں آپ کے لیے چائے اور کباب لاتی ہوں......''

عامر نے فوراً کہا۔ ''ضرور...... امی کے لیے بھی......''

وہ جی اچھا کہہ کے کچن میں آ گئی۔ گیٹ پہ بیل ہوئی تو عامر نے دیکھا اس بار وہاں کوئی اور نہیں صائمہ تھی۔ صائمہ کو یوں اتنے عرصے بعد دیکھ کے وہ حیران رہ گیا۔ اُسے جلدی سے اندر آنے کا کہا۔ صائمہ کو دیکھ کے جس قدر حیرانی عامر کو ہوئی تھی اس سے بڑھ کے خوشی رفعت کو۔ وہ اس خوشی کو آمنہ سے شیئر کرنے کچن میں چلا آیا۔ مگر وہاں جا کے اس کا ارادہ بدل گیا اور اُسے سسپنس میں ڈال کے واپس لان میں آ گیا۔

آمنہ جب چائے لے کر لان میں آئی تو صائمہ کو اپنے سامنے دیکھ کے ایک ساعت کو سکتے میں آ گئی۔ قدم جمے کے جمے رہ گئے۔ اُسے کچھ سمجھ نہ آیا کہ وہ کیا کرے کیا کہے۔ اس کی اس کنڈیشن کو دیکھتے ہوئے صائمہ نے خود آگے بڑھ کے اُسے گلے لگا لیا۔ آمنہ کے زخم پھر سے ہرے ہو گئے۔ ماضی جس کو بھلانے کی وہ ہر وقت کوشش کرتی رہتی تھی حال بن کے اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ آنکھیں پھر سے نم ہو گئیں۔ کچھ دیر وہ صائمہ کے گلے لگ کے روتی رہی۔ عامر اور رفعت نے دونوں کو تنہا چھوڑ دیا تا کہ وہ جی بھر کے باتیں کر سکیں۔ کچھ دیر وہ یوں ہی کھڑی رہیں۔ پھر بیٹھ گئیں۔ آمنہ

نے بہت گلے شکوے کیے۔ اور وہ ان کو چپ چاپ سنتی رہی۔ پھر جب اُس نے اپنے بارے بتایا کہ وہ اسد کی وفات کے بعد بہت عرصہ بیمار رہی اُسے ہسپتال میں بھی داخل رہنا پڑا اور اب جوں ہی طبیعت ذرا سنبھلی ہے اس سے ملنے چلی آئی ہے۔ تو آمنہ کے سب گلے شکوے دور ہو گئے۔

آمنہ نے روتے ہوئے کہا۔

''سب ختم ہو گیا......''

صائمہ کی آنکھیں بھی نم تھیں۔ ''میرے لیے بھی......بس اب تو زندگی کے دن گن رہی ہوں......''

آمنہ نے اُسے دلاسا دیا۔ ''ایسا مت کہیے...... ماضی کو بھول جائیں اور مستقبل کی فکر کریں...... میں نے سنا ہے آنٹی اور انکل آپ کی شادی آپ کے چچازاد سے کرنا چاہتے ہیں......''

''تم نے ٹھیک سنا ہے......''

''تو پھر......''

''تو پھر کیا......تم جانتی ہو......''

''آپ اُن کی بات مان لیں...... ماضی سے جڑے رہنے سے حال اور مستقبل دونوں تباہ ہو جاتے ہیں......''۔

صائمہ نے کہا۔ ''اگر یہ سب میں تم سے کہوں تو......''

''میری بات اور ہے......''

''تمہاری اور میری بات ایک ہی ہے......اگر تم اسد کی بہن ہو تو میں بھی اس کی کچھ لگتی ہوں......''۔

''مگر میں نہیں چاہتی کہ آنٹی اور انکل کے دل سے میرے بھائی کے لیے کوئی بد دعا نکلے اور ان کی روح کو تکلیف ہو......آپ سمجھ رہی ہیں نا!''

صائمہ اس کی بات پر خاموش رہی۔ کچھ دیر رکنے کے بعد اجازت چاہی اور وہاں سے چلی آئی۔ جب وہ گھر لوٹی تو سیدھا اپنے کمرے میں آ گئی۔ ماں نے اس کی اُداسی دریافت کرنے کی بہت کوشش کی۔ مگر اُس نے یہ کہہ کے دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا کہ وہ کچھ دیر سونا چاہتی ہے۔ وہ خود سے سوال کر رہی تھی۔

''آخر کوئی میرے دل کی کیفیت سمجھنے کو کوشش کیوں نہیں کرتا......کیا رشتے صرف خون کے ہوتے ہیں؟......دلوں کے رشتے کوئی معنی نہیں رکھتے......کیا ایسے رشتوں کو جب جی چاہے بھول جایا کرتے ہیں؟''

اس کے پاس ان سب سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ اور شاید کوئی بھی اس کے سوالوں کا جواب نہ دے سکتا تھا۔

صائمہ سے ملنے کے بعد آمنہ کی طبیعت ذرا سنبھلی تو اُس نے ایک بار پھر لائبریری کا رُخ کیا۔ وہ آج بھی اُسی ٹیبل پر بیٹھا اُس کا منتظر تھا۔ مگر آج اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے لائبریری کی دنیا بدلی ہوئی ہے سناٹا گنگنا رہا ہے۔ خاموشیاں ٹوٹ گئیں ہیں۔ انتظار ختم ہو رہا ہے۔ وہ اس تبدیلی پر حیران تھا کیونکہ اس کے سامنے والی ٹیبل خالی تھی۔ وہ دل میں سوچ رہا تھا کہ آخر یہ سب کیا ہے۔ اچانک اس نے اپنے دل کی آواز سنی جو اُسے کہہ رہا تھا۔

وہ سامنے نہیں ہے اے دل مگر جانے کیوں

آج اس کی موجودگی کا احساس ہو رہا ہے

اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ وہ اس کے سامنے آ کے بیٹھ گئی۔ اُسے دیکھ کے وہ فرطِ حیرت میں ڈوب گیا۔ اُسے کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ وہ خود کو کہہ رہا ہے۔ "تم اُس سے محبت کرنے لگے ہو......" کیونکہ ایسی کیفیت صرف محبت کرنے والوں کی ہوتی ہے......اُن کے دلوں کی خوشیاں......اردگرد کی اُداسیاں محبوب سے جڑی ہوتی ہیں......موسم بھی محبوب کی آمد کا احساس دلاتا ہے۔

تم جو آئے ہو تو جی اُٹھا ہوں میں

وگرنہ تم سے بچھڑنا ہی کافی تھا مرنے کو

وہ بت بنا اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے لیے تو آج عید کا چاند نکل آیا تھا۔ اس چاند کو دیکھ کے وہ اس کی جدائی کے روزے بھول گیا بھوک پیاس کی شدت جاتی رہی۔ دل نے تہیہ کر لیا کہ اب وہ اسے کھونے نہیں دے گا۔ جوں ہی اس کا وقت ختم ہوا اور وہ لائبریری سے نکل کے گھر کو واپس آنے کے لیے گاڑی کے پاس آئی تو اُس نے بھی اپنی گاڑی سٹارٹ کر لی۔ اور اس کا پیچھا کرتے کرتے اس کے گھر تک پہنچ گیا۔ گھر کا اتہ پتہ معلوم ہو گیا تو جیسے اُسے تسلی ہو گئی ہو کہ اب وہ اس سے بچھڑ نہیں سکتی۔ اگلے روز جب وہ لائبریری میں داخل ہوئی تو اُسے دیکھ کے اُس سے رہا نہ گیا۔ ہر قسم کے نتائج سے بے خبر ہو کے اُس کے پاس آ گیا۔

"ہیلو......"

آمنہ نے نظر اُٹھا کے اُسے دیکھا اور پھر دوبارہ نظر جھکا لی جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو......

"آپ نے لائبریری آنا چھوڑ دیا۔ خیریت تو تھی۔ مجھے بہت فکر ہو رہی تھی کہ خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو نہ گیا ہو......"

آمنہ نے غصے سے جواب دیا۔ "آپ کو کیوں فکر ہو رہی تھی؟......میرا آپ کا رشتہ کیا ہے؟......"

اُس نے جواب دیا۔ "میرا آپ سے بہت گہرا رشتہ ہے مگر آپ نہیں جانتی......"

وہ طیش میں آ گئی۔

"مجھے لگتا ہے آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے......اس قسم کی باتیں یا تو کوئی بے وقوف شخص کر سکتا ہے یا پاگل......نہ میں آپ کو جانتی ہوں اور نہ آپ......پھر اس قسم کی احمقانہ باتیں کرنے والے کو احمق ہی کہا جا سکتا ہے......"

"پلیز آپ غصہ نہ ہو......میں وہی ہوں جو آپ کو دیکھا کرتا تھا جس کی وجہ سے آپ نے ٹیبل تبدیل کر لی۔"

آمنہ آگ بگولہ ہو گئی۔ "اچھا تو آپ ہے وہ احمق......آپ کو کوئی مسئلہ ہے کیا؟"

وہ مسکرا کے بولا۔ "جی مجھے کوئی مسئلہ نہیں......میرا نام شاہد ہے......"

"میں نے آپ سے آپ کا نام پوچھا......"

''مگر میں نے بتا دیا......''

''اب میں آپ کے نام کا کیا کروں؟......''

''ارے میں نے یہ کب کہا؟''

آمنہ نے پوچھا۔'' آپ چاہتے کیا ہیں؟''

شاہد کو تو جیسے موقعہ مل گیا ہو فوراً بولا۔ '' آپ کو......''

''آمنہ میری پیاری بہن بھائی کی شرٹ استری کردو......دیکھو نا میں تمہارا سب سے پیارا بھائی ہوں......اور تم میری پیاری سے بہن......''

اسد نے اُسے پیار سے گلے لگا لیا۔

''بھائی آپ واقعی مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں......''

اسد نے پیار بھر لہجے میں جواب دیا۔

''یہ بھی بھلا پوچھنے والی بات ہے......مجھ سے بڑھ کر محبت تو کوئی تمہیں کر ہی نہیں سکتا......مجھ سے بڑھ کے کوئی چاہنے والا دیکھو تو بات کرنا......''

آمنہ نے پوچھا۔'' آپ کبھی مجھے چھوڑ کے تو نہیں جاؤ گے......''

اسد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔''پگلی جو آپ کو چاہتا ہے وہ کبھی چھوڑ کے نہیں جاتا......''

ان باتوں نے آمنہ کو پھر سے رلا دیا اور غصے سے شاہد سے کہا۔

''چلے جائیں یہاں سے، کوئی مجھے نہیں چاہتا، کوئی بھی نہیں، اگر چاہتے تو چھوڑ کے نہ جاتے'' یہ کہتے ہوئے وہ وہاں سے چلی آئی۔

شاہد بھی اس کے پیچھے آیا۔ گاڑی کا دروازہ کھولنے لگی تو اُس نے کہا۔''دیکھیں آپ غلط مت سمجھیں......میرا مقصد آپ کو دُکھ دینا نہ تھا۔''

وہ بولی۔'' آپ کا جو بھی مقصد ہو مجھے اس سے کوئی غرض نہیں......پلیز آپ جائیں۔''

کچھ اور کہنے سنے بغیر گاڑی میں سوار ہوئی اور گھر لوٹ آئی۔ وہ واپس لائبریری میں آیا کتابیں سمیٹیں کیونکہ اب اس کا بھی پڑھنے کا موڈ نہ رہا تھا۔ اس لیے گھر آ گیا۔ کمرے میں لیٹا وہ یہ سوچ رہا تھا کہ آخر وہ اس قدر اُداس اور دُکھی کیوں ہے؟ کس نے اُسے چھوڑ دیا ہے؟ اُسے چاہنے کے لفظ سے اتنی نفرت کیوں ہے؟ یہ سب سوالات اس کے دماغ میں گھوم رہے تھے۔ کوئی الٹا سیدھا جواب سوچنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔

☆

قاری صاحب اورنگ زیب کے ہمراہ ٹریننگ سنٹر پہنچے تاکہ لڑکوں کا معائنہ کر سکیں۔ وہ لڑکوں کو دیکھ کے بہت خوش ہوئے۔ کیونکہ انہیں ہر قسم کی صورت حال سے نپٹنے کو تیار کیا جا چکا تھا۔ وہ فائرنگ بم بلاسٹ سے لیکر اغواہ کرنے کی مکمل تربیت حاصل کر چکے تھے۔ سب شلوار قمیصیں پہنے ہوئے تھے۔ چہروں پر ہلکی ہلکی سی داڑھیاں تھیں۔ عمریں تقریباً سولہ سترہ سال کے لگ بھگ تھیں۔ سب میں ایک جوش نظر آتا تھا۔ ایک پھرتی جھلک

رہی تھی۔ان کے دل جذبہ شہادت سے سرشار تھے۔اور شہادت کے عہدے پر فائز ہونے کو بے تاب تھے۔موت کو جنت سمجھ رہے تھے۔جب ان کا پلاٹون کمانڈر یہ نعرہ لگاتا۔

''موت کیا؟''

تو وہ زور سے کہتے۔

''زندگی''

جب وہ کہتے

''موت سے ڈرنا نہیں......''

تو آواز آتی۔

''یہ ہے بزدلی......بزدلی......''

''ہم کیا چاہتے؟''

''جنت......جنت......شہادت ہے جنت''

اور پھر ایک زوردار نعرہ تکبیر بلند ہوتا۔قاری صاحب ان کا یہ جذبہ دیکھ کے خوشی سے سرشار ہو رہے تھے۔کیونکہ موت کا ڈر اگر مشن کی ناکامی تھی تو اس کا سامنے کرنے کا حوصلہ اس کی کامیابی،اور یہ وہ حوصلہ تھا جس کی وجہ سے وہ آج تک بہت سے کامیاب خودکش حملے کر چکے تھے۔قاری صاحب اور تنگ زیب کو ٹریننگ سنٹر میں موجود لڑکوں کی پلاٹون کا معائنہ کروانے کے بعد رخصت کر دیا گیا۔ان کے رخصت ہوتے ہی ایک بار پھر گل خان اور سیف الرحمٰن انہی تنگ و تاریک راستوں سے ہوتے ہوئے اُسی اندھیر کوٹھری میں آئے۔آج پھر ان کے سامنے وہی شخص منہ دوسری جانب پھیرے کھڑا تھا۔اُن کے قدموں کی آہٹ سے اُسے اُن کی آمد کی خبر مل گئی تھی۔

''تم آگئے......''

''یس سر......''

وہ پھر بولا ''کیا خبر ہے؟''

''دھماکہ کامیاب رہا......''

''شاباش......شاباش......''

گل خان نے پوچھا۔''سر اگلا ہدف کونسا ہے؟''

ہنستے ہوئے۔''خیبر بازار......خیبر بازار''

سیف الرحمٰن ''اب ہم جائے......''

''کامیابی ملنا چاہیے......''

گل خان نے یقین دلایا۔ ''ہمارا لڑکا بہت بہادر ہے......سو فیصد کامیابی کا توقع رکھیے......''

''توقع نہیں ہمیں یقین چاہیے......''

''سر یقین رکھیں......''

پھر وہ دونوں انہی راستوں سے ہوتے ہوئے واپس سنٹر پہنچ گئے۔ آج اُنہیں دو ایسے لڑکوں کو حملے کے لیے تیار کرنا تھا۔ جو دوست تھے۔ ان کو ٹارگٹ ایریا تک پہنچانے کے لیے ڈرائیور کو آرڈر کر دیا گیا۔ اس کی ڈیوٹی انہیں ٹارگٹ سے چند قدم پیچھے اُتارنے کی تھی۔ باقی کا سارا کام ان دونوں کے ذمہ تھا۔ جوں ہی ان کو بلوایا گیا وہ فوراً حاضر ہو گئے۔ خود کو تیار کیا اور سب کو خدا حافظ کہتے گاڑی میں سوار ہو گئے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی جذبہ شہادت سمندر کی لہروں کی طرح ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ اس جہان فانی سے کوچ کرنے کی آرزو مچلنے لگی۔ جنت میں داخل ہونے کی خواہش نے بے چین کر دیا۔ سارے راستے وہ اسی قسم کی باتیں کرتے رہے۔ جب گاڑی سے ڈرائیور نے اُنہیں اُترنے کا کہا تو جھٹ سے چھلانگیں لگا دیں۔ پہلے تو انہوں نے اردگرد دیکھا اور پھر ایک دوسرے کو اپنا اپنا راستہ سمجھانے لگے۔ دو مختلف راستوں کے انتخاب کا مقصد آسانی سے ٹکرانے کے لیے کیا گیا۔ اب وہ اپنے اپنے راستوں پر گامزن تھے۔ چلتے چلتے ایک کے دماغ میں سوال اُٹھا۔

''تم کیا کر رہے ہو؟......بے گناہ اور معصوم انسانوں کو مارنے جا رہے ہو......کیا یہ ظلم نہیں؟''

وہ اسے شیطانی خیالات سمجھا جو مومن کے جذبہ جہاد کو کمزور کرتے ہیں۔ اُسے ان کے اُمڈنے کا پہلے سے علم تھا کیونکہ کمانڈر نے اُسے بتا دیا تھا کچھ شیطانی خیالات تمہیں پیچھے ہٹنے کا کہیں گے اور اگر تم ان خیالات میں آ کے واپس پلٹے تو تمہاری موت کافری ہوگی۔ اس نے فوراً لاحول ولا قوۃ پڑھا اب اس کے ذہن میں یہ باتیں گونج رہی تھیں یہ جہاد ہے جہاد۔ جو لوگ اللہ کی راہ میں جان کا نذرانہ پیش کرتے ہیں وہی مومن ہیں اُنہی کے لیے جنت ہے۔ وہ خود کو اس سعادت سے کسی صورت بھی محروم کرنے کو تیار نہ تھا۔

یہ سوچتے وہ چل رہا تھا کہ بہت جلد وہ جنت میں ہوگا ان شیطانی وسوسوں سے دور۔ چلتے چلتے وہ ٹارگٹ پہ پہنچ گیا اسی لمحے دوسرا لڑکا بھی وارد ہو گیا دونوں پرہجوم جگہ میں ایک دوسرے سے ٹکرائے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس جہاں سے رخصت ہو گئے۔ وہ تو چلے گئے مگر اپنے ساتھ بہت سے دوسروں کو بھی زندگی سے محروم کر گئے۔ مرنے والوں میں سے شاید کسی کے دل میں بھی ایسا کوئی جذبہ نہ تھا۔ مرنے کی خواہش نہ تھی مگر وہ ڈھیر ہوئے پڑے تھے بلکہ بوٹی بوٹی ہو گئے تھے۔

دھماکے ہوتے ہی خبر پہنچ گئی سب نے ایک دوسرے کو مبارک باد دی۔ قاری صاحب بھی اورنگ زیب کی حویلی پر یہ خوشخبری سنانے آ چکے تھے۔ اسے وہ اپنی فتح کا نام دے رہے تھے۔ ایسی فتح جس کا خواب انہوں نے دیکھا تھا۔ ان کے خیال میں یہ حق کی فتح تھی۔ برائی و فحاشی کے خلاف جنگ میں نیکی کی فتح تھی۔ مرنے والے مظلوم اور بے گناہ نہیں بے حیا تھے۔ شریعت پر پابند نہ رہنے والوں کے لیے وہ اسی قسم کی موت تجویز کر رہے تھے۔ ایک دوسرے کو مبارک باد دینے کے ساتھ ساتھ اس مشن کو تیزی سے آگے بڑھانے کے لیے عہد و پیماں بھی کر رہے تھے۔ حویلی میں سجان

اللہ۔ ماشاءاللہ۔ اللہ اکبر کی صدائیں گونج رہی تھیں۔

رفعت نے اچانک ٹی وی آن کیا تو اس وقت خیبر بازار میں دھماکے کی خبر چل رہی تھی۔ اس نے فوراً ٹی وی کا والیم بند کر دیا۔ اب اس کے سامنے وہ قیامت کا منظر تھا جہاں ہر طرف لاشیں بکھری پڑیں تھیں۔ دکانیں جلی ہوئی تھیں۔ زخمیوں کی آہ و پکار سنائی تو نہ دے رہی تھی مگر ان کے چہروں سے ان کے درد کی شدت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ کئی ریسکیو ٹیمیں زخمیوں کی امداد کے لیے وہاں موجود تھیں۔ وہ انہیں اُٹھا کے ایمبولینس میں لے جاتے جو انہیں لیے وہاں سے رخصت ہو جاتی اور اس کی جگہ نئی کھڑی ہوتی۔ ہر طرف کالا دھواں نظر آ رہا تھا۔ رفعت کو آمنہ کے قدموں کی آہٹ سنائی دی تو فوراً اُس نے ٹی وی آف کر دیا۔ آمنہ نے خبر سن لی تھی مگر اُس نے بھی انجان بننے کی ایکٹنگ کی۔

''آنٹی کیا بات ہے آپ کچھ اُداس لگ رہی ہیں؟''

رفعت نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''نہیں بیٹی تمہیں ضرور غلط فہمی ہوئی ہوگی...... بھلا میں کیوں پریشان ہونے لگی؟''

اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور سوال کرتی گیٹ پر لگی بیل نے اُسے اُٹھنے کا موقعہ فراہم کر دیا۔ عامر کے آتے ہی موضوع بدل گیا۔ اُس نے آتے ہی جاب کے متعلق بتانا شروع کر دیا۔ باتیں اس قدر دلچسپ تھیں کہ وہ سب بھول گئی۔ گھنٹی کی آواز سن کے گفتگو میں خلل آ گیا عامر کو اُٹھ کے جانا پڑا۔ جب وہ واپس لوٹا تو اس کے ساتھ ایک عورت اور اس کا بیٹا تھا۔ انہیں ڈرائنگ روم میں بیٹھا کے وہ کمرے میں آیا۔

''امی آپ سے کوئی ملنے آیا ہے......''

''مجھ سے...... بھلا مجھ سے کون ملنے آ سکتا ہے؟''

عامر نے جواب دیا۔

''وہ تو یہ ہی کہہ رہی تھیں...... کہ انہیں آپ سے ملنا ہے......''

رفعت عامر کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ گئی اور آمنہ کتاب پکڑ کے پڑھنے بیٹھ گی۔ رفعت اور عامر کے آنے پر وہ دونوں کھڑے ہو گئے۔

رفعت نے انہیں بیٹھنے کا کہا۔ رسمی سلام و دعا کے بعد اُن سے ان کے آنے کا مقصد پوچھا تو وہ بولی۔

''میرا نام عفت ہے یہ میرا اکلوتا بیٹا شاہد ہے......''

رفعت نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''وہ تو سب ٹھیک ہے مگر میں یہ جاننا چاہوں گی کہ آپ کی تشریف آوری کا مقصد کیا ہے؟''

عفت نے کہا۔ ''میں وہی بتانا چاہ رہی ہوں...... میں یہاں آپ کے پاس کچھ مانگنے آئی ہوں......''

''مانگنے......'' عفت نے کہا۔

''جی میں دراصل آپ کی بیٹی کو اپنی بیٹی بنانا چاہتی ہوں''

''میری بیٹی...... مگر میری تو کوئی بیٹی نہیں......''

''تو کیا آمنہ آپ کی بیٹی نہیں......''

''اچھا تو آپ آمنہ کی بات کر رہی ہیں......جی......جی آپ اُسے میری ہی بیٹی سمجھیں......''

رفعت نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔''اس میں کوئی شک نہیں کہ میری کوئی بیٹی نہیں......مگر میں آپ کی بیٹی کو اپنی بیٹی بنا کے رکھوں گی۔آپ کو کبھی شکایت نہیں ہوگی......شاہد میرا اکلوتا بیٹا ہے اور اس کی خوشیاں مجھے اپنی زندگی سے زیادہ عزیز ہیں۔......آمنہ میرے بیٹے کی خوشی ہے......''

عامر نے کہا۔''آنٹی بات یہ نہیں......''

عفت نے پھر سوال کیا۔''تو پھر کیا بات ہے؟''

رفعت نے عفت کو ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا۔آمنہ کے دُکھ کو جان کے وہ بھی غمزدہ ہو گئی۔یہ ساری باتیں سننے کے بعد شاہد سمجھ گیا کہ آخر وہ اس قدر اُداس،کھوئی کھوئی اور دُکھی کیوں رہتی ہے۔اس کا صدمہ بھی بڑا تھا اگر کوئی بھی اس کی جگہ ہوتا تو اسی قسم کا ری ایکٹ کرتا۔یہ سب جاننے کے باوجود عفت نے اپنی اُسی خواہش کا اظہار کر دیا۔

''ہم ابھی تھوڑا اُسے بیاہنے کو آ رہے ہیں......جب آمنہ بیٹی اس صدمے سے نکل آئے گی تب تو آپ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔''

عامر اور رفعت نے رضامندی کا اظہار کر دیا۔پھر وہ دونوں رخصت ہو گئے۔مگر عامر نے شاہد کو کل ملنے کے لیے بلا لیا۔



خیبر میں حملے کی کامیابی نے قاری صاحب کو اورنگ زیب کی قدر و قیمت کا اور زیادہ احساس دلایا۔ کیونکہ حملہ کرنے والے اسی کے بھیجے ہوئے لڑکے تھے۔ اب تو قاری صاحب خود ایک خطیر رقم لے کے اُس کے پاس پہنچ گئے۔ تا کہ وہ اور سرگرمی سے اپنے مشن کو پھیلا سکیں۔ مزید رقم ملنے کے وعدے نے اورنگ زیب کی آنکھوں میں اس مشن میں بڑھ چڑھ کے حصہ لینے کی چمک پیدا کر دی۔ وہ بار بار قاری صاحب کو یقین دلا رہا تھا کہ وہ بے حیائی اور فحاشی کی اس جنگ میں ان کا بھرپور ساتھ دے گا۔ حتیٰ کہ اپنی جان تک کا نذرانہ پیش کرنے کی بھی آفر کر دی۔ قاری صاحب اس کے اس جذبے سے بہت متاثر ہوئے۔

''ہم کو تم پر فخر ہے...... ہم تمہارے لیے اور رقم کا بندوبست کرے گا۔ بس تم زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اکٹھا کرو...... جہاد کا تعلیم دو اور پھر ہمارے حوالے کرتے جاؤ اور اپنا کمیشن وصول کرتے جاؤ۔''

باقی کا ذمہ داری ہمارا ہے۔



اگلے روز جب شاہد عامر سے ملنے آیا تو سب سے پہلے اس کی ملاقات گارڈن میں ٹہلتی آمنہ سے ہوگئی۔ اُسے گھر پا کے حیران ہونے کے ساتھ ساتھ وہ غصے میں بھی آگئی۔

''آپ...... آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟...... میں ابھی عامر بھائی کو بلواتی ہوں وہی آپ کا دماغ درست کرینگے......''

شاہد نے جواب دیا۔ ''ضرور...... ضرور...... کیونکہ مجھے اُنہی سے ملنا ہے......''

اُسے یقین نہ ہوا کہ وہ عامر سے ملنے کے واسطے آیا ہے۔ مگر اس سے پہلے وہ عامر کو بلاتی وہ خود آ گیا۔ شاہد نے آگے بڑھ کے مصافحہ کیا اور پھر اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں چلا آیا۔ وہ اس اچانک دوستی پر حیرت زدہ تھی کیونکہ وہ عامر کے تقریباً سبھی دوستوں سے واقف تھی۔ پھر یہ سوچ کے خاموش رہی کہ شاید ان سے دوستی کا اُسے علم نہ ہو۔ اس پر مزید سوچنے کی بجائے وہ پودوں کو دیکھنے میں مصروف ہوگی۔

''آمنہ تم شاہد کو کمپنی دو...... میں بس دو منٹ میں آیا۔''

شاہد نے کہا۔ ''اچھا تو آپ کا نام آمنہ ہے؟''

روکھے سے انداز میں بولی۔ ''جی...... ''

''بالکل آپ کی طرح خوبصورت''

آمنہ نے مڑ کے دیکھا۔ ''جی...... کیا کہا آپ نے......''

اُس نے فوراً بات بدل دی۔ ''میرے کہنے کا مطلب ہے آمنہ نام کی لڑکیاں بہت خوش نصیب ہوتی ہیں......''

آمنہ نے جواب دیا۔ ''مگر میں ایسا نہیں سمجھی...... ''

''کیوں؟''

''آپ کو بتانا ضروری نہیں......''

شاہد نے کہا۔

''آپ ڈریں مت......آپ کے بھائی ہی مجھے یہاں چھوڑ کے گئے ہیں......''

آمنہ نے غصے سے کہا۔ ''آپ کو کس نے کہا میں ڈر رہی ہوں......دیکھیں مسٹر......''

اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔''جی میرا نام مسٹر نہیں شاہد ہے......''

''جی تو مسٹر شاہد پہلی بات تو یہ کہ میں کسی سے ڈرتی ورتی نہیں اور دوسری بات یہ کہ میں آپ کے کسی بھی سوال دینے کی پابند نہیں ہوں......''

شاہد نے موضوع بدل ڈالا۔

''چلیں یہ تو بتادیں آپ کے لائبریری جانے کا مقصد کیا ہے؟''

اس کے جواب دینے سے قبل ہی عامر وہاں آ گیا۔

''ارے یار شاہد تم بھی عجیب وغریب باتیں کر رہے ہو......لوگ بھلا لائبریری کیوں جاتے ہیں۔ اسٹڈی کے علاوہ بھی کوئی مقصد ہوتا ہے وہاں جانے کا......''

شاہد نے اس کی بات کی تردید کرتے ہوئے کہا۔ ''جی نہیں......ہر کوئی اسٹڈی کے لیے تھوڑی جاتا ہے......''

عامر نے سوال کیا۔''تو کس لیے جا سکتے ہیں؟''

وہ دونوں محو گفتگو ہوئے تو آمنہ نے وہاں سے کھسکنے کی کوشش کی مگر عامر نے اُسے روک لیا۔

''آمنہ رکو......تم سے ضروری بات کرنی ہے......''

وہ رُک گئی۔''جی بھائی......''

عامر نے شاہد سے کہا۔ ''یار شاہد تم ذرا میری پیاری بہن کو لائبریری تک پک اینڈ ڈراپ کی فیور دے سکتے ہو......گاڑی مجھے چاہیے......بس چند دنوں کیلئے......''

آمنہ نے شاہد کے جواب کا انتظار کیے بغیر کہا۔''میں رکشے یا ٹیکسی سے چلی جایا کروں گی......آپ فکر مت کریں......خواہ مخواہ میں کسی کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں......''

شاہد نے فوراً جواب دیا۔''یار عامر تم فکر ہی نہ کرو......اپنوں کو فیور دی جاتی ہے اور اس فیور سے خوشی ملتی ہے نا کہ تکلیف......ویسے بھی مجھے بھی تو روز وہیں جانا ہوتا ہے......میں کونسا اسپیشل آپ کو چھوڑنے جایا کروں گا۔''

عامر نے اب ان کی گفتگو کے لیے موضوع کے بارے بھی سوچ لیا۔''یار شاہد آمنہ جہاد کے بارے ریسرچ کر رہی ہے......اگر تم اس کا ساتھ دو تو اس کی مدد ہو جائے گی......بڑے بوڑھوں کا قول ہے ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں......تم دونوں مطالعہ کرو گے تو یقیناً جلد کامیابی ہوگی۔''

آمنہ کے پاس اب کہنے کو کچھ نہ تھا لہٰذا خاموش رہنا ہی اس کو بہتر لگا۔ شاہد آج بہت خوش تھا اور جب وہ گھر لوٹا تو گنگنا رہا تھا۔ اُسے یوں دیکھ کے عفت نے خدا کا شکر ادا کیا۔ گھر لوٹتے ہی اس نے کل کے لیے پلان بنانا شروع کر دیا۔ سارے کپڑے بیڈ پر ڈھیر کیے وہ کل کے لیے ڈریس کے بارے سوچنے لگا۔ عفت جب اس کے کمرے میں آئے تو کپڑوں کی یہ حالت دیکھ کے مسکرا دی۔

''ارے یہ کیا بازار لگائے بیٹھے ہو......''

شاہد نے فکرمندی سے کہا۔ ''امی آپ ہی میری مدد کریں...... میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا......''

''آخر بات کیا ہے؟''

خوش ہوتے ہوئے جواب دیا۔ ''ماں بدولت کو ڈرائیور کی جاب مل گئی ہے...... اب سمجھ نہیں آ رہی کون سا ڈریس پہنوں۔''

عفت نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''میں سمجھی آمنہ مل گئی ہے...... ادھر میرا چاند ڈرائیور بننے پر خوش ہو رہا ہے۔ ڈریس سلیکٹ کرنے کی کیا ضرورت ہے کوئی سا بھی پہن لو ...... ویسے بیٹا ہمارے حالات خدانخواستہ اتنے بُرے نہیں کہ تمہیں ڈرائیور کی نوکری کرنی پڑے۔''

شاہد نے جواب دیا۔ ''میری ماں...... میری پیاری ماں...... میں خاص قسم کا ڈرائیور ہوں......''

''خاص قسم کا......''

''جی...... مجھے آمنہ کو پک اینڈ ڈراپ کرنا ہے''

''تو یوں کہو نا!''

پھر دونوں ماں بیٹا کل کے لیے کپڑے تیار کرنے لگے۔ شاہد نے پرفیوم بھی سلیکٹ کر لیا۔ جوتے پالش کیے۔ بس کچھ ریڈی کرنے کے بعد پرسکون ہو کے بیڈ پر لیٹ گیا۔

صائمہ چھت پر بیٹھی ان لمحوں کو سوچ رہی تھی جب اسد زندہ تھا۔ وہ ہر وقت ان کے گھر میں گھسی رہتی تھی۔ صبح سے شام تک اس کا ڈیرا اسد کا گھر ہوتا۔ رات کو بھی اگر مجبوری نہ ہوتی تو شاید وہیں رہتی۔ ماں باپ ناراض ہوتے ڈانٹتے مگر اُسے ان کی ناراضگی کی پرواہ نہ تھی اور نہ ہی ان کی ڈانٹ کا اس پر کوئی اثر تھا۔ صائمہ وہاں صرف اسد کی وجہ سے نہ جاتی بلکہ آمنہ اور سکینہ کی محبت بھی اُسے وہاں کھینچ لے جانے کا سبب تھی۔ سکینہ نے آج تک اس میں اور آمنہ میں رتی برابر بھی فرق نہ آنے دیا تھا۔ اس لیے اُسے بھی کبھی احساس نہ ہوا کہ وہ کسی غیر کے گھر میں ہے۔ وہ دن بھر آمنہ کے ساتھ رہتی اور جب شام کو اسد لوٹتا تو کچھ دیر رُکنے کے بعد واپس آ جاتی ایک دن دس بج گے مگر اسد ابھی تک گھر نہ پلٹا۔ اُسے جہاں گھر جانے کی فکر ستا رہی تھی تو وہاں اسد کے بارے سوچ نے اُسے گھیر رکھا تھا۔ گھر جانے کی سوچ بھی اس وجہ سے تھی کہ امی ابو پریشان ہو رہے ہونگے۔ پریشانی کے عالم میں کبھی اِدھر تو کبھی اُدھر ٹہل رہی تھی۔ آمنہ کے کہنے کے باوجود وہ گھر جانے کو تیار نہ تھی۔ تقریباً ساڑھے دس ہو گئے۔ ادھر اسد نے گھر میں قدم رکھا تو اُدھر اس کی ماں بھی چلی آئی۔ اُس نے ڈانٹنا شروع کر دیا۔

''دوقدم کا فاصلہ ہے کم از کم ماں کو خبر ہی کر دی ہوتی...... میں اور تمہارے ابو کتنے فکر مند تھے...... کچھ اندازہ ہے تمہیں......''

مگر اُسے اب بھی کوئی پرواہ نہ تھی بس اتنا کہہ دیا۔

''آ تو رہی تھی......''

ماں کو خالہ کے ساتھ باتیں کرتے دیکھا تو خود اسد کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ اس وقت بیڈ پر ستانے کے لیے لیٹا تھا۔ کمرے میں آ کے نہ آؤ دیکھا اور نہ تاؤ شروع ہوگئی۔

''اسد تم بہت بے حس ہو...... میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں اور تم ہو کہ نہ سلام نہ دُعا سیدھا کمرے میں آ گئے...... تمہیں تو میری ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں میں ہی ہوں جو پاگلوں کی طرح تمہیں چاہتی ہوں...... میں نے فیصلہ کر لیا ہے آئندہ تمہیں اپنی صورت بھی نہیں دکھاؤں گی......''

وہ جانے لگی تو اسد نے اُسے روک لیا۔

''ارے بابا لڑو تو مت......''

غصے سے بولی۔ ''لڑوں بھی نہ...... تو کیا کروں؟''

''پہلے کسی کی بات سن لیا کرتے ہیں اس کے بعد فیصلہ کرنا چاہیے...... میں تو کب کا گھر کے لیے نکلا ہوا ہوں بس راستے میں ٹریفک بلاک ہوگئی تھی......''

''ٹریفک بلاک ہوگئی تھی مگر کیوں''

''دھماکہ جو ہوا ہے......''

فوراً اُس سے پوچھا۔ ''تم تو خیریت سے ہو نا!''

''خیریت سے ہوں تو یہاں ہوں ورنہ اس وقت ٹکڑے ٹکڑے ہوئے سڑک پر نہ پڑا ہوتا......''

''اللہ نہ کرے...... شکر ہے خدا کا تم زندہ سلامت ہو......''

وہ بات کر رہی تھی کہ اس کے کانوں میں ماں کی آواز پڑی جو اُسے بلا رہی تھی۔ صبح جلدی آنے کا کہہ کے وہ اس کے کمرے سے باہر صحن میں آ گئی۔ وہ اب صحن میں نہیں چھت پر کھڑی تھی جہاں سوائے ماضی کی پرچھائیوں کے کچھ بھی نہ تھا۔ ارد گرد دیکھا تو اُسے اپنے علاوہ فضا بھی ماتم کرتی محسوس ہوئی۔

''اسد لوٹ آؤ...... خدا کیلئے لوٹ آؤ...... اے میرے پروردگار آخر لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ کیوں دوسروں کی خوشیاں چھین لیتے ہیں؟''

وہ انہیں ظالم کہہ رہی تھی ان کو بددعا دے رہی تھی جو دلوں کو اُجاڑ دیتے ہیں۔ جو آنکھوں میں انتظار بھر دیتے ہیں وہ اُن لوگوں کے لیے سراپا سوال تھی جو انسان کے جسم سے دل نکال کے اُسے زندہ رہنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ اُس کے ذہن میں یہ سوالات اُبھر رہے تھے یہ ظالم کب تک ظلم کریں گے؟ کب تک دلوں کو اُجاڑیں گے؟ کب تک آنکھوں کو نم کرتے رہیں گے؟

وہ انہیں کلمہ گو نہیں سمجھتی تھی جو اللہ کی مخلوق کو قصاب کی طرح کاٹ ڈالتے ہیں۔

''کیا یہ ہے آپ ﷺ کے اُمتی''

پھر خود ہی اس کا جواب دینے لگی۔

''نہیں یہ آپ ﷺ کی اُمتی نہیں ہو سکتے...... آپ ﷺ تو اس جہاں کے لیے رحمت، محبت کا پیغام دینے والے، دُکھیوں کی مدد کرنے والے، ہر ایک کو ہنسانے والے، بے سہارا کے سہارا، بے کسوں کے حامی، اے میرے رب انہیں بے نقاب کر، ان کا ہاتھ روک دے، ورنہ قیامت سے پہلے قیامت آجائے گی تیرے بندے بے گناہ بندے یوں روز مرتے رہیں گے اسد لوٹ آؤ پلیز لوٹ آؤ......''

☆

آصف کے گھر پر اجمل اور کاشف موجود تو تھے۔ مگر ان کے چہروں پر آج اُداسی تھی۔ ایک دوسرے سے ناراض ناراض سے لگ رہے تھے۔ کوئی کسی سے بات کرنے کو تیار ہی نہ تھا۔ جب اس کی ماں چائے دینے کے واسطے کمرے میں آئی تو ان کے اترے چہرے، اُداس نظریں اور بکھری سوچوں کو دیکھ کے پریشان ہو گئی۔ اُس کا خیال تھا کہ اس کی آمد پر ضرور کچھ نہ کچھ کہیں گے مگر جب یہ سکوت نہ ٹوٹا تو اُس نے خود ہی سوال کر ڈالا۔

''تم سب اس قدر غمگین کیوں ہو؟''

ان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ شاید وہ خود بھی اس بات سے لاعلم تھے کہ ان کی اُداسی کی وجہ کیا ہے۔ بہادر سے ملنے کے بعد وہ اس وجہ کو تلاش کرنے کی کوشش میں تھے جو اس قدر معصوم بچوں کو بھی نڈر بنا کے سینکڑوں انسانوں کے قتل پہ مجبور کر دیتے ہیں۔ مولانا صاحب سے ملنے کے باوجود وہ مطمئن نہ ہوئے۔ کئی روز سے وہ اُن سے ملنے بھی نہ گئے تھے۔ اُن کے دلوں میں عجیب سا خوف بیٹھا ہوا تھا۔ لوگوں کی زندگیاں چھن جانے کا خوف؟ کسی کے اجڑنے کا خوف؟ ملک کی تباہی کا خوف؟ بربادی کا خوف؟ اور جانے کتنے خوفوں نے اُنہیں جکڑ لیا تھا۔ پہلے پہل تو وہ ایک دوسرے کا مذاق اُڑاتے رہے مگر وقت گزرنے کے ساتھ بہادر نے اُنہیں واقعی خوف زدہ کر دیا۔

''بیٹا تم سب خاموش کیوں ہو؟...... کچھ تو بولو...... تم لوگوں کی خاموشی میرے دل میں عجیب سے وسوسے پیدا کر رہی ہے، یہ خاموشی ہمیشہ طوفان کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ ہمارے ملک میں پہلے ہی خون کا طوفان اُمڈا ہوا ہے، اور کسی طوفان کے ہم متحمل نہیں ہو سکتے......''

آصف نے آخر لب کھولے۔ ''ماں جی سب آپ کو تنگ کرنے کو ڈرامہ کر رہے ہیں، چلو اب سیدھے ہو جاؤ ورنہ میری پیاری ماں پاگل ہو جائے گی...... چلو...... چلو''

سب ہنس دیے جیسے وہ واقعی ایکٹنگ کر رہے تھے۔ اُنہیں ہنستا مسکراتا دیکھ کے اُسے تسلی ہوگی اور انہیں چائے پینے کا کہہ کے کمرے سے باہر چلی آئی۔ آصف نے اب ان کی خبر لی۔ ''کب تک یوں منہ لٹکائے بیٹھے رہو گے، چھوڑو یہ سوچنا وچنا، چائے پیو چائے''

سب نے چائے پینا شروع کر دی۔ آصف نے اُنہیں سمجھایا کہ جلد ہی ٹینس سچویشن ختم ہو جائے گی اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر یہ بات اپنی جگہ تھی کہ بہادر سے ملنے کے بعد اُنہیں اس حقیقت کا سامنا ہو گیا تھا کہ واقعی بچے اور نوجوان سینکڑوں لوگوں کی جانیں لے رہے ہیں۔ اس واقعہ

سے قبل تو صرف اُنہوں نے سن رکھا تھا مگر جب کسی حقیقت کو قریب سے دیکھ لیا جائے۔ تو اس سے نظریں چرانا مشکل ہو جاتا ہے۔ کبھی بم دھماکے صرف سننے یا ٹی وی پر دیکھنے کی حد تک تھے مگر بہادر اس بات کی دلیل تھا کہ موت کسی بھی شخص کے بہت قریب ہو سکتی ہے۔ وہ نالاں تھے خود سے کیونکہ وہ کسی کے لیے کچھ نہ کر پا رہے تھے۔ حالات حکمران، ناانصافیوں کو وہ اس صورت حال کا ذمہ دار ٹھہرا رہے تھے۔



قاری صاحب کی موجودگی کبھی بہادر کے لیے باعث مسرت ہوا کرتی تھی مگر اب اُن کی باتیں اُن کی موجودگی اُسے تکلیف دے رہی تھی۔
ادھر قاری صاحب اُسے جہاد کی قدر و فضیلت کا درس دے رہے تھے تو اُدھر اُس کے کانوں میں کاشف کے الفاظ گونج اُٹھتے ''ایک بے گناہ انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے...... '' وہ اُلجھ کے رہ گیا تھا۔ خود سے سوال کر رہا تھا۔
''کیا ہم جہاد کر رہا ہے؟...... کیا ہم جہاد نہیں کر رہا؟...... کیا ہم قاتل بننے جا رہا ہے؟...... کیا ہم لوگوں کو دُکھی کرتے ہیں؟...... کیا ہم بے حیائی کو ختم کر رہے ہیں؟''
وہ ان سوالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ اس کے کانوں میں قاری صاحب کے الفاظ پڑے۔
''ہم اس ملک سے برائی اور بے حیائی کو ختم کر کے دم لے گا، ہم کو اس وقت تک لڑنا ہو گا جب تک بے حیا موجود ہیں......''
بہادر کو پڑھنے کا شوق تھا کچھ بننے کی تمنا تھی مگر حالات کی ستم ظریفی کہ وہ ان کے ہاتھ لگ گیا۔ انہوں نے نہ صرف اُسے اس کے والدین سے دور کر دیا بلکہ اس کی آرزوؤں کا گلا بھی گھونٹ دی۔ اس کی خواہشوں کو چھین لیا۔ وہ سوچ رہا تھا جب اُسے اغوا کیا گیا تو وہ معصوم تھا مگر اب وہ اس قدر نڈر ہو گیا ہے کہ اوروں کی زندگیاں چھیننے سے بھی نہیں ڈرتا۔ وقت نے اُسے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ وہ کس قدر مجبور ہے کہ دل کی بات کسی کو بتا بھی نہیں سکتا۔ اس کی قسمت میں صرف مرنا اور مارنا لکھ دیا گیا ہے۔ قاری صاحب درس دے رہے تھے اور وہ اکبر کے ساتھ اپنی اُلجھی سوچوں کو شیئر کرنے کا سوچ کے آہستہ سے بولا۔
''اکبر''
اکبر نے کان اس کے قریب کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا بات ہے؟''
اس نے پوچھا۔ ''کیا ہم یہ سب ٹھیک کر رہا ہے؟''
اُس نے چہرہ تو قاری صاحب کی جانب ہی رکھا اور آہستہ سے بولا۔ ''کیا......''
''جہاد......''
''تو اور کیا غلط کر رہا ہے...... تم پاگلوں جیسا بات کیوں کرتا ہے؟''
اس کا جواب سن کے اُسے یقین ہو گیا کہ کوئی بھی اس کی بات نہیں سمجھ سکے گا اس لیے خاموش ہو گیا۔
جوں ہی قاری صاحب نے اپنی بات ختم کی اُنہیں فائرنگ کے لیے بلا لیا گیا۔ سب لڑکے باری باری اُٹھ کے فائرنگ رینج کی طرف چل

دیے۔ وہ بھی چل تو ان کے ساتھ ہی رہا تھا مگر سوچوں میں ڈوبا ہونے کی وجہ سے اندازہ ہی نہ تھا کہ قدم کدھر جا رہے ہیں۔ جب فائرنگ رینج میں پہنچے تو وہ بھی اپنی پلاٹون کے لڑکوں میں بیٹھ گیا۔ اکبر نے ایک دوبار اُسے بلانے کی کوشش کی مگر اُسے تو جیسے اردگرد کی خبر ہی نہ ہو۔ وہ خود کو تنہا محسوس کر رہا تھا بالکل تنہا۔ بچپن میں جب کبھی اُسے خوف محسوس ہوتا تو وہ ماں کی گود میں پناہ لے لیتا تھا آج اُسے وہ گود بہت یاد آ رہی تھی۔ وہ چھپنا چاہتا تھا۔ تاکہ کوئی اُسے ڈھونڈ نہ پائے۔ کمانڈر کو خبر نہ ہو کہ وہ کہاں ہے۔ مگر نہ ماں کی گود تھی اور نہ گھر کی پناہ گاہ۔



شیر گل شام کو جو گھر لوٹا تو سنبل کچھ پریشان دکھائی دی۔ وہ چولہے کے سامنے بیٹھی کسی گہری فکر و پریشانی میں کھوئی ہوئی تھی۔ چارپائی پر بیٹھتے ہوئے اُس نے پوچھا۔

''تم آج ہم کو پریشان نظر آ رہا ہے...... خیر ہے نا!''

پہلے تو اس نے ٹال مٹول کی مگر پھر اُس کے بار بار اصرار کرنے پر کہنے لگی۔

''شیر گل آج ہم کو بہادر بہت یاد آ رہا ہے...... جانے کون لوگ تھا جو ہمارا بیٹا کو اغوا کر کے لے گیا...... آج ہمارا دل کہہ رہا ہے کہ وہ بہت پریشان ہے ہمیں یاد کر رہا ہے......''

شیر گل بھی دُکھی ہو گیا کھویا ہوا بیٹا اُسے پھر سے یاد آ گیا۔

''یاد تو وہ ہمیں بھی بہت آتا ہے...... مگر ہم اُس کو کہاں ڈھونڈے''

بہادر کو یاد کرتے کرتے آج پھر اُس کی زبان پر اُن بچوں کی بھی یاد تھی جسے انہوں نے اپنی مرضی سے مدرسے میں بھجوا دیا تھا۔ اپنی مرضی سے اُنہیں خود سے جدا کر دیا تھا

''تم نے ہمارا دوسرا بچہ بھی ہم سے چھین لیا...... ہمیں آج ان کا بھی یاد آ رہا ہے...... وہ بھی اُداس ہے...... ہمیں یاد کر رہا ہے۔''

شیر گل نے اب اسے سنبل کا وہم قرار دے دیا۔ مگر تنہا بیٹھا وہ یہ ضرور سوچ رہا تھا کہ اگر سنبل وہم کا شکار ہے تو پھر یہ وہم جانے کا نام کیوں نہیں لے رہا۔ کئی مہینوں سے وہ بچوں کی خیریت کو نہ جا سکا تھا۔ جب بھی وہ اُسے جانے کا کہتی وہ ٹال دیتا۔ آج اُس نے بیوی کی حالت دیکھی تو فیصلہ کیا کہ وہ قاری صاحب سے ملنے ضرور جائے گا۔ بچوں کو دیکھ کے آئے گا۔ مگر ابھی اُس نے اس کا تذکرہ سنبل سے نہ کیا۔ تاکہ واپسی پر وہ اُسے بچوں کی خیریت بتا کے حیران کر سکے۔

اگلے ہی روز اُس نے گھر میں بیوی کو ضروری کام کا کہا اور مدرسے کے لیے نکل پڑا۔ کئی میلوں کی مسافت طے کرنے کے بعد وہ مدرسے پہنچا تو اس کی ملاقات قاری صاحب سے نہ ہو پائی۔ امجد نے اُسے بتایا کہ وہ ضروری کام سے گئے ہوئے ہیں۔ یہ وہی امجد تھا جس کو دیکھتے ہوئے اُس نے بچوں کو مدرسے داخل کروانے کا فیصلہ کیا تھا۔ قاری صاحب کی غیر موجودگی پر تو اُسے حیرت نہ ہوئی البتہ جب امجد کی زبانی اُسے خبر ملی کہ اُس کے بچوں کو بڑے مدرسے بھجوا دیا گیا ہے تو وہ پریشان ہو گیا۔

امجد نے اُسے تسلی دی۔

''شیر گل پریشان ہونے کا بات نہیں......جس کا کارکردگی اچھا ہوا اُسے قاری صاحب بڑے مدرسے بھجوا دیتے ہیں......تم خدا کا شکر ادا کرو کہ تمہارا بچہ لائق ہے......اطمینان سے گھر جاؤ......''

شیر گل کے پاس اب وہاں رُکنے کا کوئی جواز ہی نہ رہا تھا۔ چپ چاپ اُٹھا اور گھر کو چل دیا۔ گاڑی پر سوار کئی میلوں کی مسافت طے کرنے کے بعد جب گھر پہنچا تو فیصلہ کر لیا کہ وہ بیوی کو کچھ نہیں بتائے گا۔ اگر وہ یہ جان گئی تو اور پریشان ہو جائے گی۔

آج وہ کافی دیر سے گھر لوٹا تھا۔ جلدی جانے اور دیر سے لوٹنے پر سنبل نے وجہ دریافت کی تو مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

''ہم تمہارا بچہ سے ملنے کے واسطے مدرسہ گیا تھا......''

اُس نے جلدی سے پوچھا۔

''سب کیسا ہے؟''

''اچھا......بہت اچھا......تم تو خواہ مخواہ میں وہم کا شکار ہوتا ہے......وہ تو پہلے سے زیادہ صحت مند ہو گیا ہے......''

ان سب باتوں کو سننے کے باوجود اُس نے دل میں عجیب سے بے چینی محسوس کی۔

''تم کہتا ہے تو یقین کر لیتی ہوں......مگر جانے کیوں دل نہیں مان رہا......''

''اچھا! اب جاؤ ہمارا واسطے کھانا لاؤ......ہمیں بھوک لگا ہے......''

سنبل اُٹھ کے شیر گل کے لیے کھانا لینے چلی گئی۔

عبداللہ بھی کئی مہینوں بعد مدرسے بچوں کی خیریت دریافت کرنے گیا مگر اُسے بھی بچوں سے ملنے کی اجازت نہ دی گئی۔ اُسے یہ کہہ کے بھجوا دیا گیا کہ روز روز بچوں سے ملنے کی وجہ سے اُن کی پڑھائی متاثر ہوتی ہے۔ ایک بار بچے والدین سے مل لیں تو کئی مہینوں تک روتے رہتے ہیں۔ وہ بیچارا بھی چپ چاپ واپس آ گیا۔

ماں بھی بچوں سے ملنے کو بے تاب تھی مگر اُن سے ملنے کو جانا اُس کے لیے بہت مشکل تھا۔ کیونکہ ڈاکٹروں نے اُسے زیادہ سفر کرنے سے منع کیا تھا۔ وہ جب بھی جانے کی ضد کرتی عبداللہ اُسے یہ کہہ کے ٹال دیتا کہ جب تندرست ہو جاؤ گی تو ضرور چلی جانا۔ مگر وہ صحت مند ہونے کی بجائے دن بدن مزید بیمار ہوتی جا رہی تھی۔ اور یہ ہی الفاظ سنتے سنتے اس کی زندگی کی ڈور ٹوٹنے لگی۔ اور آخر ایک روز اپنے لختِ جگر سے ملنے کی خواہش اور آرزو دل میں لیے ہی اس جہانِ فانی سے ہمیشہ کے لیے کوچ کر گئی۔

عبداللہ اب اپنی کوٹھری میں تنہا رہ گیا تھا اس کی شریکِ حیات اُسے تنہا چھوڑ کے چل بسی تھی۔ بچوں سے ملنے کو جی چاہتا تو اُن کے مدرسے پہنچ جاتا مگر نہ تو اس کی ملاقات قاری صاحب سے ہو پاتی جن کے حوالے اُس نے اپنے بچے کیے تھے اور نہ کوئی اُسے اس کے بچوں سے ملواتا۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اُسے واپس جانے کا کہہ دیا جاتا اور وہ ٹوٹے دل کے ساتھ مایوس ہو کر واپس اپنی کوٹھری میں آ جاتا۔ پہلے پہل تو وہ ہر ہفتے بعد بچوں سے

ملنے جایا کرتا تھا اور ہمیشہ سب سے مل کے آتا تھا۔ ایک دو سال تک تو اُسے کوئی مشکل کا سامنا نہ ہوا۔ مگر پھر بیوی کے بہت زیادہ بیمار رہنے کی وجہ سے وہ اُن سے ملنے نہ جا سکا اور جب گیا تو اُسے بچے نہ ملے۔

کوٹھری میں تنہا بیٹھے وہ یہ سوچتا رہتا آخر یہ کیسی تعلیم ہے جس کو حاصل کرنے میں بچے والدین سے بچھڑ جاتے ہیں۔ اُن کے ملنے سے اُن کی تعلیم متاثر ہوتی ہے۔ اُس نے تو اپنے بچوں کو دینی تعلیم کے لیے داخل کروایا تھا۔ وہ دین جس نے والدین کی خدمت کا حکم دیا ہے جس نے اُن کو پیار سے دیکھنے کا ثواب ایک حج کے برابر رکھا ہے جس نے انہیں اُف تک کہنے سے منع فرمایا ہے۔ مگر وہ تو اس سے جدا ہو گئے تھے۔ اس نے تو سوچا تھا وہ دین بھی سیکھ جائیں گے اور بھوکا پیٹ بھی بھر پائیں گے۔ ان کی بھوک مٹاتے مٹاتے وہ آج اُن کی شکلوں کو بھی ترس گیا ہے جب اس کے پاس تھے تو بھوک ضرور تھی مگر انہیں جی بھر کے دیکھ تو پاتا تھا۔

کئی کئی روز وہ کوٹھری میں بھوکا پیاسا پڑا رہتا کیونکہ اب اُس سے محنت مزدوری نہ ہوتی تھی۔ کچھ بیوی کی جدائی نے اور کچھ بچوں سے بچھڑنے کے غم نے اُسے بیمار کر دیا تھا۔ نقاہت اور کمزوری کی وجہ سے کام نہ کر پاتا۔

اس کے سات بچے تھے مگر اس کی دیکھ بھال، عیادت اور خبر گیری کو کوئی ایک بھی نہ تھا۔ اور اس کا قصور وار وہ خود کو ٹھہراتا۔ ☆



کالج گراؤنڈ میں آصف دوستوں کے ساتھ حکومتی ناانصافیوں کا ذکر چھیڑے بیٹھا تھا۔ کہ اُسے سامنے اسلم آتا دکھائی دیا۔ اسلم اس کے سکول کے زمانے کا دوست تھا۔ میٹرک تک دونوں نے تعلیم اکٹھے حاصل کی مگر اس کے بعد دونوں نے الگ الگ کالجز میں ایڈمیشن لے لیا۔ آج وہ پانچ سال بعد اُسے ملنے آیا تھا۔ اسلم کافی دیر سے اُسے تلاش کر رہا تھا مگر وہ اُسے ڈھونڈ نہ پایا۔ اب بھی آصف نے ہی اُسے دیکھا تو وہاں سے اُٹھ کر اس کی طرف آیا۔ آصف کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا دونوں بڑی گرم جوشی سے ایک دوسرے کے گلے ملے اور پھر آصف اُسے کاشف اور اجمل کے پاس لے آیا۔ اُس نے اس کا تعارف اجمل اور کاشف سے کرواتے ہوئے کہا۔

''یہ میرا اسکول فرینڈ اسلم...... میٹرک کے بعد ہم دونوں نے اپنی راہیں الگ کر لیں تھیں۔''

دونوں نے باری باری اُس سے ہاتھ ملایا۔ کاشف جلدی سے کینٹین پر گیا اور چار کپ چائے کا آرڈر دے آیا۔ چند ہی منٹوں میں چائے ان کے پاس تھی۔ سب نے مل کر چائے نوش کی۔ کافی دیر اِدھر اُدھر کی ہانکتے رہے۔ ملکی حالات پر اُفسوس کرتے رہے۔ اچانک آصف نے اُس سے آنے کی وجہ دریافت کی۔

''اور پھر آج اِدھر کا چکر کیسے لگا لیا؟...... یقیناً کسی کام سے آئے ہو گے......''

اسلم نے افسردہ سا چہرہ بناتے ہوئے جواب دیا۔ ''آیا تو کام ہی سے تھا...... مگر کام نہ ہو سکا......''

کاشف نے پوچھا۔ ''کس کام سے......''

اسلم کا چہرہ پھر سے افسردہ ہو گیا۔ ''لسٹ دیکھنے آیا تھا......''

ابھی اُسنے بات مکمل نہ کی تھی کہ وہ تینوں ہنسنے لگے اُنہیں یوں اچانک ہنستے دیکھ کر وہ حیران و پریشان ہوگیا۔ نہ تو اُس نے کوئی ایسی حرکت کی تھی اور نہ کوئی اچھوتی بات پھران کا یوں ہنسے چلے جانا اُس کی سمجھ سے باہر تھا۔ اُسے اس حالت میں دیکھ کر آصف بولا۔

''یار تم پریشان مت ہو...... کیونکہ یہ نہ تو تم پہ ہنس رہے ہیں اور نہ تمہاری کسی بات پہ...... یہ دونوں تو تمہاری قسمت کا مذاق اُڑا رہے ہیں جس نے تمہارے ساتھ مذاق کیا...... آصف کی باتوں نے اُسے اور فرط حیرت میں ڈال دیا۔''

''میرے پلے تمہاری باتیں نہیں پڑ رہیں......''

آصف نے بات کو آسان الفاظ میں بیان کرتے ہوئے کہا۔

''یار سیدھی سے بات ہے ہم جانتے ہیں تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے؟...... تم نے ایجوکیٹرز کے لیے اپلائی کیا ہوگا لسٹ میں نام بھی آیا ہوگا ......مگر جب دوبارہ لسٹ آویزاں ہوئی تو تم اُڑ چکے تھے......''

اسلم نے جواب دیا۔ ''ہاں یہی ہوا ہے...... کیا تم نے بھی اپلائی کیا تھا؟''

کاشف نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ''یار ہم اس مذاق کا حصہ بننے سے بچ گے...... تھینکس گاڈ''

اجمل نے اُس کی شرمندگی کو محسوس کرتے ہوئے اُسے دلاسا دیا۔

''یار اسلم تم شرمندہ یا پریشان کیوں ہوتے ہو، یہ اس ملک کا قانون ہے، کالا قانون، یہاں تو گنگا الٹی بہتی ہے، بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے جو سوئے وہ کھوئے مگر آج یہ غلط ثابت ہوگیا ہے، اب تو جو سوئے وہ پائے کا دور ہے...... کھونے کے لیے سونا لازم نہیں......''

آصف نے کہا۔ ''رشوت، سفارش اور چاپلوسی وہ کنجیاں ہیں جن سے یہاں تالے کھولے جاتے ہیں، عقل و ہنر سے بنائی گئی چابی کسی کام نہیں آتی...... جتنا مرضی زور لگاؤ تالا کھلنے کا نام ہی نہیں لیتا...... جن کے پاس ان تینوں میں سے کوئی ایک بھی کنجی موجود ہو وہ بآسانی تالا کھول کر اندر داخل ہو جاتے ہیں''

اسلم نے ان کی باتیں سننے کے بعد جواب دیا۔ ''مگر یار ہم پھر بھی اُمید لگائے بیٹھے تھے...... اس لیے پریشانی بھی ہوئی اور دُکھ بھی''

کاشف نے مسکراتے ہوئے شعر سنایا۔

غموں تجھے مجھ سے بیر ہے صرف اس لیے
کہ میں شہری ہوں اس ملک کا

اسلم مسکرایا تو ضرور مگر کہنے لگا۔ ''آخر ایسا کب تک چلے گا۔ کب تک ہم ناانصافیوں کی چکی میں پستے رہیں گے۔''

آصف نے کہا۔ ''یار یہ ناانصافیاں تو ہمارے ملک اور اس کی عوام کا مقدر ہیں...... ہمیں تو اب ان کا عادی ہو جانا چاہیے۔''

سب نوجوانوں کی طرح یہ بھی ناانصافیوں سے عاجز آچکے تھے۔ ان کی طرح ہر کوئی حکمرانوں سے نالاں تھا۔ ہر کوئی حکمرانوں کی کسی نہ کسی زیادتی کا شکار جو تھا۔ آصف نے اسلم کے چہرے کی اُداسی دیکھی تو اس کا دھیان کہیں اور بانٹنے کے لیے کھانے کا آرڈر دینا چاہا مگر اُس نے صاف انکار

کر دیا۔ وہ سمجھ گیا کہ چونکہ اس کا زخم ابھی تازہ ہے اس لیے درد کی شدت زیادہ ہے۔ جوں ہی وقت گزرے گا یہ مندمل ہو جائے گا اور وہ پھر سے نارمل روٹین پر آ جائے گا۔

کاشف نے اسلم کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرنے کے لیے کہا۔

"یار افسردہ مت ہو، مرنا اس عوام کا مقدر ہے، کوئی بم دھماکوں سے مر رہے ہیں تو کوئی ظلم سے، کوئی بے روزگاری، غربت و افلاس اور بھوک سے تو کوئی، ناانصافی سے...... باقی کے بچے کچے بیماریوں کی نذر ہو جا رہے ہیں...... جب مرنا مقدر میں لکھ دیا گیا ہے تو کھا پی کر مروں۔" اتنا کہہ کر وہ کینٹین کی طرف چل دیا۔



آمنہ کمرے میں تنہا بیٹھی صائمہ کے بارے سوچ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس کے بھائی سے بے پناہ محبت کرتی تھی اور کرتی ہے۔ مگر اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کے والدین یہ نہیں چاہتے کہ وہ اسد کے نام پر اپنی ساری عمر گزار دے۔ اُنہیں دُکھی دیکھ کر اُسے تکلیف ہوتی تھی مگر صائمہ اُس کی کوئی بات ماننے کو تیار نہ تھی۔ وہ اس کی باتیں سن تو لیتی مگر عمل نہ کرتی۔ چند روز قبل جب بشریٰ اُس سے ملنے آئی تو اُس نے آمنہ کے سامنے ہاتھ باندھ دیے۔

"بیٹی تجھے اللہ کا واسطہ ہے صائمہ کو سمجھاؤ، اسد بیٹا زندہ ہوتا تو میں اور صائمہ کے ابو انتظار بھی کر لیتے مگر اب تو وہ بیچارا جہاں گیا ہے وہاں سے واپسی ممکن نہیں، ہم مجبور ہیں اُسے سمجھاؤ کب تک ہمارے سہارے بیٹھی رہے گی، کل کلاں کو ہماری آنکھیں بند ہو گئیں تو کس در کی خاک چھانے گی، خدانخواستہ کوئی اونچ نیچ ہو گی تو قبروں میں بھی ہماری روحیں تڑپ پڑے گئیں......"

آمنہ نے تبھی فیصلہ کیا کہ وہ اس کے گھر جائے گی اُسے سمجھائے گی مگر اُس کا وہاں جانا بھی کام نہ آیا۔

سب کچھ بتانے کے باوجود اُس نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اور اُسے کہا۔

"میں کل بھی اسد کی تھی آج بھی ہوں اور ہمیشہ رہوں گی......"

اب بھی صائمہ کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ وہ کیا کرے کدھر جائے؟ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ اُس نے صائمہ کو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ "تمہارا بھائی کے ساتھ کوئی قانونی رشتہ نہیں تو پھر تم اس کی خاطر اپنی عمر کیوں برباد کر رہی ہو۔ کیوں دل کے رشتے کو خون کے رشتوں پر ترجیح دے رہی ہو۔ اسد کو بھول جاؤ۔"

مگر یہ سب باتیں بھی رائیگاں گئیں۔ صائمہ کے کہے لفظوں نے اس کے ذہن میں یہ سوالات اُبھار دیے کہ کیا دلوں کے رشتوں خون کے رشتوں کی طرح مضبوط اور عزیز ہوتے ہیں؟ کیا ہم اُن کی خاطر اپنی عمریں گنوا دیتے ہیں جنہیں دلوں میں بسا لیتے ہیں؟

مگر اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا کیونکہ وہ خود ابھی تک کسی ایسے جذبے سے آشنا نہ ہوئی تھی۔ ذاتی تجربے کے بنا وہ اس بات کو وثوق سے کہنا نہ چاہتی تھی۔

صائمہ کو وہ لمحہ ابھی بھی یاد تھا جب اسد نے اُس سے پوچھا۔ ''کیا تم میری خاطر اپنی عزیز ترین چیز گنوا سکتی ہو......''

صائمہ نے ایک لمحے کے توقف کے بغیر کہا۔ ''ہاں......''

اُس نے پھر سوال کر ڈالا۔ ''کیا تم اپنی عمر اپنی جوانی گنوا سکتی ہو...... میرا مطلب ہے اگر میں کہیں چلا جاؤں اور عمر بھر لوٹ کے نہ آؤ''

وہ گھبرا گئی۔ ''اللہ نہ کرے...... جو تم مجھے چھوڑ کے کہیں جاؤ......''

مگر وہ پھر بھی بضد تھا کہ وہ اپنا فیصلہ سنائے۔ تب اس نے جواب دیا۔

''میں ایک عمر تو کیا ہزار عمر اور جوانی تمہاری خاطر قربان کر سکتی ہوں......''

اسد نے اس وقت جو کہا اُسے خود بھی علم نہ تھا کہ وہ انجانے میں کیا کہہ گیا ہے۔ مگر شاید ہماری چھٹی حس بعض اوقات ہم سے وہ بھی کہلوا دیتی ہے جو آئندہ ہمارے ساتھ پیش آنا ہوتا ہے۔ جس سے ہم خود بھی بے خبر ہوتے ہیں۔ یہ سب سوچتے سوچتے صائمہ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے۔

''میں آج پھر اپنے عہد کی تجدید کرتی ہوں کہ میں تم پر ایک عمر اور جوانی تو کیا ہزار عمر بھی قربان کر سکتی ہوں۔''

بشریٰ کے کانوں میں صائمہ کے کہے ہوئے الفاظ پڑے تو وہ اس کے قریب آ کے بیٹھ گئی اُسے سمجھانے لگی کہ وہ ایسا مت کہے۔ والدین کا خیال کرے۔ جب وہ نہیں رہا جس سے عہد کیا تھا تو پھر عہد کو توڑنے میں کیا مذائقہ ہے۔ مگر وہ اس بات کو ماننے کو تیار ہی نہ تھی کہ اسد اُسے چھوڑ گیا ہے اس کا یقین تھا کہ وہ زندہ ہے اس کے اردگرد رہتا ہے۔ وہ یہ عہد نہیں توڑ سکتی چاہے کچھ بھی ہو۔

آمنہ بیڈ پہ لیٹی کتاب پڑھ رہی تھی کہ دروازہ ناک ہوا۔

''آنٹی آ جائیں......''

رفعت نے اُسے اطلاع دی۔ ''بیٹی شاہد بیٹا آیا ہے......''

اُس نے وجہ دریافت کی تو اس کی یاددہانی کو کہنے لگی۔

''بیٹی آج سے تمہیں شاہد بیٹا کے ساتھ لائبریری جانا ہے...... جلدی سے آ جاؤ وہ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔''

اُس نے ٹال مٹول کی بہت کوشش کی۔ مگر رفعت نے اُسے کہا۔ ''یہ عامر کا آرڈر ہے......''

اب وہ بیچاری مجبور ہو گئی۔ رفعت اُسے جلدی آنے کا کہہ کے چلی آئی۔ آمنہ نے بیگ ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ بیگ تو قریب ہی رکھا تھا مگر افراتفری میں دکھائی ہی نہ دیا۔ اچانک نظر پڑی تو اپنی بے وقوفی پر خود کو ملامت کرنے لگی۔ جب بیگ اُٹھائے ڈرائنگ روم میں آئی تو شاہد رفعت کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر رفعت نے کہا۔

''اچھا بیٹا اب تم جاؤ......''

شاہد نے آمنہ کو مسکرا کے دیکھا۔ ''چلیں......''

وہ گھبرا گئی ''جی......''

دونوں رفعت کو خدا حافظ کہہ کر ڈرائنگ روم سے گیراج میں آ گئے۔ شاہد نے گاڑی کا فرنٹ ڈور کھول کے اُسے بیٹھنے کا کہا وہ بیک سیٹ پر بیٹھنا چاہ رہی تھی مگر آنٹی کی آواز سن کے اُسے مجبوراً فرنٹ سیٹ پر بیٹھنا پڑا اُس کے بیٹھتے ہی شاہد نے دروازہ بند کر دیا اور خود سٹیرنگ سنبھال لیا۔ اب گاڑی گیراج سے سڑک پر آ چکی تھی۔ وہ کافی دور نکل آئے تھے مگر ابھی تک وہ خاموش بت بنے بیٹھی تھی۔ وہ بیچارا انتظار کر رہا تھا کہ آمنہ کچھ کہے مگر جب بھی اُس نے اس کی طرف دیکھا ہمیشہ اُسے کھڑکی سے باہر کے مناظر کا نظارہ کرتے ہی پایا۔ آخر تھک ہار کے بولا۔

''باہر صرف ٹریفک ہے......''

وہ پھر بھی خاموش رہی۔

''آپ گونگی ہیں کیا؟''

تب بھی وہ خاموش ہی رہی۔

''لگتا ہے میرے ساتھ بولنا منع ہے......''

اب اُس نے کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں......''

آمنہ کو لگا کہ اگر وہ اب نہیں بولے گی تو وہ کچھ غلط سمجھ بیٹھے گا اس لیے اُسے مجبوراً بولنا پڑا......

شاہد تو کب سے انتظار میں تھا کہ وہ کچھ کہے تا کہ اُسے بھی بولنے کا موقعہ ملے۔ اب جو موقعہ ملا تو اسے ہاتھ سے گنوائے بغیر پورا پورا فائدہ اُٹھانا چاہا۔ ''شکر ہے آپ بولی، ورنہ میں تو سمجھا تھا آپ نے چپ کا روزہ رکھا ہوا ہے، یا میرے ساتھ ہمکلامی کرنے سے منع کیا گیا ہے......''

''مجھے بھلا کون منع کرے گا؟''

''ارے بھائی آنٹی یا پھر عامر......''

''وہ کیوں منع کریں گے، اگر انہوں نے یہ سب کرنا ہوتا تو آپ کے ساتھ آنے کی اجازت کیونکر دیتے۔''

''ارے آپ تو غصہ ہو گئی......''

''آپ نے بات ہی ایسی کی ہے......''

''اچھا بابا معاف کر دیں، میری توبہ میرے باپ کی توبہ......''

''It's ok''

''ایک بات کہوں اگر آپ ناراض نہ ہوں......''

''اگر ناراض ہونے والی بات ہوئی تو ضرور ہوں گی، اس لیے بات سوچ سمجھ کے کیجیے گا......''

''آپ نے تو ابھی سے بُرا مان لیا، چلیے رہنے ہی دیتے ہیں......''

وہ خاموش ہو گیا۔ وہ اپنی ہی دنیا میں کھو گئی۔ اُسے کسی بات کا احساس نہ تھا۔ وہ کہاں ہے؟ کس کے ساتھ ہے؟ شاہد نے اُسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا۔

''آمنہ کبھی تو خاموش ہو جایا کرو، ہر وقت بولتی رہتی ہو......''

''بھائی میں کہاں بولی ہوں، اگر میں خاموش ہو جاؤں تو کہتے ہیں میں خاموش کیوں ہو؟ اور اگر بولو تو خاموشی کی تلقین شروع ہو جاتی ہے''

اسد نے کہا۔''میں تمہیں گھر میں بولنے کا کہتا ہوں مگر گاڑی میں خاموشی اچھی چیز ہے......''

''کیوں؟''

''تا کہ اردگرد کے مناظر کو انجوائے کیا جا سکے۔ اگر شور شرابا ہوگا تو پھر انجوائے منٹ کی بجائے بوریت ہونے لگتی ہے......''

آمنہ نے منہ بنالیا۔

''اب میں خاموش ہوں، آپ انجوائے کریں مناظر کو......''

شاہد نے کہا۔''پلیز آمنہ کچھ بولو......''

آمنہ جو اپنی ہی دنیا میں گم تھی جھٹ سے بولی۔ ''پہلے خود ہی تو بولنے کو منع کیا تھا......''

شاہد حیران ہو گیا۔''میں نے کب منع کیا ہے؟''

شاہد کی آواز نے اُسے اسد کے خیالوں سے باہر نکال دیا۔ جب خود کو اس کے ساتھ پایا تو حیرت کے ساتھ پریشانی بھی ہوئی کہ اگر خدا نخواستہ کچھ اُلٹا سیدھا منہ سے نکال دیتی تو۔ خود کو الرٹ ہونے کا کہہ کے اب صرف سامنے دیکھنے لگی۔

''ارے آپ تو پھر سے گونگی بن گئی، اس سریلی آواز کو گلے میں مت دبائیں''

''اسد بھائی بھی کبھی کبھار مجھ سے یہی الفاظ کہا کرتے تھے......''

شاہد مسکراتے ہوئے بولا۔

''مگر میں آپ کا اسد بھائی نہیں ہوں......''

اُس کے پاس شاہد کی اس بات کا کوئی جواب نہ تھا لہٰذا Silence is gold کے فارمولے پر کار بند رہنے کا سوچا۔ سارے راستے وہ بولتا رہا بہت سے سوالات بھی کیے مگر اُس نے اُس کی ساری باتیں سنی اَن سنی کر دیں۔ جیسے کوئی وہاں ہو ہی نہ۔ تھک ہار کے وہ ہی خاموش ہو گیا لائبریری کا راستہ ختم ہوتے ہی اُس نے سکھ کا سانس لیا۔ اب دونوں اسلامک بکس لیے اپنی اپنی ٹیبل پر بیٹھے مطالعہ کر رہے تھے۔ اس کے بعد شاہد کا یہ معمول بن گیا روز اُسے پک کرتا دونوں کتابیں چھانتے اور پھر اُسے ڈراپ کر کے گھر چلا آتا۔ اکثر وہ ہی بات چیت کا آغاز کرتا دس پندرہ منٹ بولتا اور پھر کوئی جواب نہ پا کے خاموش ہو جاتا۔ مگر ہر روز وہ یہ امید لیے ہوتا کہ جلد ہی وہ اس خاموشی سے نکل آئے گی اور پھر اتنا بولے گی کہ اُسے بھی اسد کی طرح کہنا پڑے گا۔

''ارے بابا! اب بولنا بھی بند کرو، یا یوں ہی نان سٹاپ گاڑی کی طرح چلتی جاؤ گی''

☆

بہادر کا ذہن اب ہر وقت اُلجھا اُلجھا سا رہنے لگا۔ اُس کے اندر ایک جنگ ہو رہی تھی۔ جسم اور روح کی جنگ، ظلم اور رحم کی جنگ، نیکی اور بدی کی جنگ، صحیح اور غلط کی جنگ، اچھے اور برے کی جنگ، سچے اور جھوٹے کی جنگ، جنت اور دوزخ کی جنگ۔ وہ اس جنگ کو کئی دنوں سے لڑ رہا تھا۔ جب بھی قاری صاحب درس وتدریس کے لیے آتے اور وہ اُن کی محفل میں بیٹھتا اُس کا ذہن فوراً اُسے وہاں سے دور لے جاتا۔ اتنی دور کہ اُسے یہ تک محسوس نہ ہو پاتا کہ جسم کہاں ہے۔ وہ روح کے ساتھ ساتھ سفر کرنے لگتا۔ دورانِ درس اُس سے کوئی بات پوچھی جاتی تو اس کا جواب ہمیشہ یہ ہی ہوتا۔

"ہم کو معلوم نہیں......"

قاری صاحب اُسے غصہ ہوتے۔ "تمہارا ذہن کہاں ہوتا ہے...... اگر جسم حاضر ہے تو ذہن بھی حاضر رکھا کرو...... ذہنی اور جسمانی موجودگی ہی تو ہمارا مشن کا کامیابی ہے، اگر ایسا کرو گے تو سزا ملے گا......"

وہ آئندہ ایسا نہ کرنے کا کہہ کے اپنی جان خلاصی کروالیتا۔ مگر وہ اس کے باوجود بھٹک جاتا۔ اُلجھی اُلجھی راہوں میں۔ بکھرے راستوں میں۔ اُس نے کئی بار فائرنگ کے دوران نشانہ غلط لیا حالانکہ وہ بہت اچھا شوٹر سمجھا جاتا تھا۔ دوڑ کے دوران بھی وہ پیچھے رہنے لگا۔ دوڑتے دوڑتے اکثر وہ چلنے لگتا کیونکہ سوچیں اُسے جکڑ لیتیں اور اُسے دوڑنے سے روک دیتیں۔ جوڈو کراٹے، ہرڈل، چھنگ، میں بھی اُس کی کارکردگی متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اب پہلے کی طرح جوشیلا بھی نہ رہا تھا۔ حالانکہ اس کی عمر کوئی چودہ پندرہ سال کے لگ بھگ تھی مگر اس کی مہارتوں کے سب گن گایا کرتے تھے۔ اب سب ہی اُس سے اس بُری کارکردگی کی وجہ معلوم کرتے مگر وہ کسی کو کیا بتاتا کہ اُس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ رات کافی بیت چکی تھی مگر وہ ابھی تک سوچوں میں گم تھا۔ اُسے ان لوگوں کا سوچ کے خوف آ رہا تھا جو آج نہیں تو کل اس کے خودکش حملے کی نذر ہونے جا رہے تھے۔ اُن کی آہ وپکار، لاشیں اُسے یہ کہہ رہی تھیں تم قاتل ہو، تم دوزخی ہو۔ تمہاری گردن پہ ہمارا خون ہے۔ مرنے والوں کے ورثاء اُسے بددعائیں دیتے صاف دکھائی دینے لگے۔ اور وہ ایک دم خوف سے چیخ اُٹھا۔ اُس کی چیخ سے اکبر کی آنکھ کھل گئی۔ اُسے جاگتا دیکھ کے پوچھنے لگا۔

"کیا بات ہے؟...... تم ابھی تک جاگ رہے ہو۔"

بہادر نے کچھ نہیں کہہ کے اُسے آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ مگر دوست کو پریشان اور اُداس دیکھ کر وہ خود بھی اُٹھ بیٹھا اس کے قریب آ کے پھر سے پوچھنے لگا۔

"آخر بات کیا ہے؟ تم ہم کو بتاتا کیوں نہیں۔ ہم کو بتاؤ۔ تمہیں معلوم ہے تمہارا انہی باتوں کی وجہ سے وہ تمہیں سزا دینے کے بارے سوچ رہا ہے......"

بہادر نے بے رُخی اور لاپرواہی سے کہا "دیتا ہے تو دے دے، ہم یہ سب نہیں کرے گا......"

"کیا نہیں کرے گا؟"

"ہم بے گناہوں اور مظلوموں کو نہیں مارے گا......"

اکبر نے جلدی سے ہاتھ اُس کے منہ پر رکھ دیا۔

''آہستہ بولو......اگر تمہارا بات اُن کے کانوں تک پہنچ گیا تو ابھی تمہارا قیمہ بنادے گا......''

''بنادے......بنادے......''

''آخر بات کیا ہے؟ ہم کسی بے گناہ کو کب مار رہا ہے''

بہادر نے اب اپنی تمام توجہ اُس کی طرف مرکوز کرتے ہوئے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

''اکبر پہلے ہم بھی یہ ہی سوچتا تھا، مگر اب ہم کو علم ہوگیا ہے کہ ہم جہاد نہیں کر رہا ہم تو بے گناہوں کو قتل کر رہا ہے، ہم انسانیت کا قاتل ہے، ایسا لوگ جنت کا حقدار کیسے ہوسکتا ہے؟''

اکبر نے اس کی باتیں سنی اَن سنی کردیں۔

''تم تو بالکل پاگل ہوگیا ہے، ہمارا خیال ہے تم کو آرام کا سخت ضرورت ہے......سوجاؤ......صبح چار بجے اُٹھنا بھی ہے، سوجاؤ، پاگل نہ بنو''

اُس نے لیٹتے ہوئے پھر پاگل کا لفظ دوہرایا۔ بہادر کو اور بھی غصہ آ گیا۔

''پاگل ہم نہیں تم سب ہے......پاگل تو ہم پہلے تھا اب تو ہوش میں آیا ہے، اے میرے اللہ یہ کیوں ہوا؟ میں کیوں ان لوگوں کے ہاتھ لگ گیا؟ کتنا اچھا ہوتا جو میں اماں کے پاس ہوتا، کہتا ہے سوجاؤ، ہم کیسے سوجائے؟ ہمارا آنکھوں کے سامنے لوگوں کو قتل کرنے کا پروگرام بن رہا ہے اور ہم سوجائے، تم سو آرام سے سو......''

وہ بڑبڑائے جارہا تھا۔ اکبر اس کی کسی بات کو نہ سن رہا تھا وہ تو کب کا نیند کی آغوش میں جاچکا تھا۔ بہادر کا بھی جی چاہا کہ وہ سوجائے مگر لیٹنے کے باوجود نیند نہ آرہی تھی۔ وہ پھر سے بے فکر ہوجانا چاہتا تھا لاپرواہی کی گود میں سر رکھ کے سونا چاہتا تھا مگر بے فکری، لاپرواہی، سکون اس سے روٹھ چکے تھے۔ کئی دن اس کی یہ ہی حالت رہی۔ کوئی بھی اس کی اس حالت سے بے خبر نہ تھا مگر یہ سوچ کے سب انسٹرکٹرز چپ تھے کہ جلد ہی یہ ذہنی حالت جاتی رہے گی اور وہ پھر سے پہلے کی طرح ہوجائے گا۔ ایک دوبار گل خان نے سیف الرحمٰن سے کہا۔

''کیوں نا اس لڑکے کو اب کی بار خودکش حملے کے لیے بھیج دیں......''

سیف الرحمٰن نے اُسے مشورہ دیا۔

''ایسا غلطی مت کرنا۔ اگر یہ بھاگ گیا۔ آج کل باغی ہوا ہے۔ باغی ہمیشہ بغاوت کرتا ہے۔ کچھ دن کا بات ہے ٹھیک ہوجائے گا......''

گل خان نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔ جب بہادر کی حالت نے سُدھرنے کا نام نہ لیا تو انہوں نے اس کے لیے زیادہ سے زیادہ مشقت کروانے کا فیصلہ کیا۔ اُسے جو ذرا سا بھی فرصت کا لمحہ ملتا وہ اُسے کسی نہ کسی کام پر لگا دیتے۔ اور آخر انہوں نے اس کی مستقل پانی بھرنے کی ڈیوٹی لگادی۔ اب وہ فرصت کے لمحات میں دو گھڑی آرام کرنے کی بجائے پہاڑی کے پار ندی سے پانی بھرنے جانے لگا۔ گو کہ وہ روز وہاں سے دور نکل آتا تھا مگر اُس نے کبھی بھاگنے کا سوچا بھی نہ تھا۔ ایک وجہ تو یہاں کے راستوں سے لاعلمی تھی کیونکہ ہمیشہ اُنہیں صرف سنٹر کے اندر رکھا گیا تھا یا اگر

کہیں جانے کی نوبت بھی آئی تو وہ خود انہیں لے کے گئے اور جہاں چھوڑتے وہاں سے لے آتے۔ دوسری وجہ جو اُسے فرار ہونے کی سوچ تک نہ آنے دیتی تھی۔ وہ یہ تھی کہ وہ جانتا تھا اس پورے علاقے میں ان کے آدمی پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لیے وہ زیادہ دور نکل نہ پائے گا کہ پکڑا جائے گا۔ انہی باتوں کو سوچ کر وہ چپ چاپ اپنا کام کرتا اور واپس لوٹ آتا۔ انہوں نے اس کے لیے جو سزا تجویز کی وہ بھی اُسے اُن سوچوں سے نکالنے میں نا کام رہی۔ البتہ اس سے اتنا فرق ضرور پڑا کہ وہ اس قدر تھک جاتا کہ لیٹتے ہی آنکھ لگ جاتی۔ جس نے اُن کو اس بات کی تسلی دلا دی کہ اب وہ بدل رہا ہے اور جلد پہلے جیسا ہو جائے گا۔

گل خان اور سیف الرحمٰن تقریباً روز ان تنگ و تاریک راستوں سے گزرتے ہوئے اُس اندھیرے کوٹھری میں جاتے ٹارگٹ ایریا معلوم کرتے اور جب لوٹتے تو سینکڑوں لوگوں کے لیے موت کا پیغام لے آتے۔ ایک دن بھی نہ گزرتا کہ لاشوں کے ڈھیر لگ جاتے۔ آہ و پکار، درد چیخوں اور فریادوں کی صدائیں گونجنے لگتیں۔ خبریں نشر ہونے لگتیں کہ فلاں مقام پر خود کش حملہ ہوا حملہ آور سولہ سترہ سال کا نوجوان تھا۔ حملے میں بہت سوں کی جانیں چلی گئی۔ بہت سے زخمی ہوئے۔ بہت سا مالی نقصان ہوا۔ ادھر یہ خبریں تھیں تو اُدھر نعرہ تکبیر بلند ہوتا۔ خدا کا شکر ادا کیا جاتا اور نئے منصوبے کی تیاری کی جاتی۔ نئے حملے کے لیے جن کے ناموں کا اعلان کیا جاتا۔ اُنہیں ان کے دوست جنّتی اور خوش نصیب کے القابات سے نوازتے۔ اور جس روز اُنہیں اپنے مشن کے لیے جانا ہوتا وہ ان کے لیے عید کا دن ہوتا۔ صبح صبح اُٹھتے نہاتے، صاف ستھرا لباس پہنتے، نماز ادا کرتے نوافل پڑھتے۔ دوستوں سے ملتے اور مبارک باد وصول کر کے گاڑی میں بیٹھتے اور مقررہ مقام پر پہنچ جاتے۔ قریب کی مسجد یا تنگ و تاریک گلی میں خود کو حملے کے مواد سے لیس کرتے اور چند ہی لمحوں بعد سینکڑوں انسانوں کو موت کی گھاٹ اُتار دیتے، اور کئی کو زخمی کر دیتے۔ بہت سا مالی نقصان ہو جاتا۔ پورے ملک میں خوف و ہراس پیدا کر کے خود بھی اس جہانِ فانی سے رخصت ہو جاتے۔ مگر جاتے ہوئے اپنا پورا جسم بھی اپنے ساتھ نہ لے جا سکتے۔ سر کہیں ہوتا، تو ٹانگ کہیں، بازو کہیں ہوتا تو دھڑ کہیں۔ جاتے ہوئے اپنے جسم کے ٹکڑوں کو بھی لیبارٹری میں معائنے کی نظر کر دیتے۔ ☆☆

خود کو جنت کا حقدار سمجھنے والا جانے کس کا حقدار بنتا۔ ہاں البتہ لوگ اُسے بددعائیں ضرور دیتے۔ لوگوں کی نظر میں جہنمی تو ساتھیوں کی نظر میں جنّتی جانے اصل میں کیا تھا۔ البتہ ایک خوش فہمی جاتے ہوئے اس کے ساتھ ضرور تھی۔

خود کش حملہ آور جانے سے قبل قاری صاحب سے جہاد کی اہمیت اور قدر و فضیلت کے بارے بہت سی باتیں ضرور سن کر جاتا اور سارے راستے انہی میں کھویا اپنا سفر طے کرتا تھا۔ ان کا اثر اس کے مرنے تک رہتا۔ اورنگ زیب بھی قاری صاحب کا ساتھ دیتا جو خود پانچویں فیل تھا۔ اور اسلام کے بارے میں زیادہ نہ جانتا تھا۔ جہاد کی اہمیت و فضیلت پر یوں روشنی ڈالنے کی کوشش کرتا جیسے وہ کوئی سکالر ہو۔ شہید کا مقام و مرتبہ، آئندہ زندگی کی نوید، جنت کا نقشہ اور اس میں داخلے کی شان اس طرح سے بیان کرتا کہ جانے والا خود کو خوش نصیب کے سوا کچھ اور سمجھنے کو تیار ہی نہ تھا۔ اُسے بتایا جاتا کہ وہ اپنے اور اپنے والدین کے لیے کامیابی خریدنے جا رہا ہے۔ اس لیے جان کا سودا ایک سستا سودا ہے۔ نرخ کم اور چیز قیمتی ہے۔ ہر شخص خود کو خوش نصیب سمجھتا اور دوسرے پہلے جانے والے کی اس خوش قسمتی پر فخر کرتے۔ اس سارے اہتمام اور تیاری کے باوجود اگر کوئی بغاوت کرنے کی کوشش کرتا تو ان کی نگرانی کرنے والے خود اپنی گولی اس کے سینے میں اُتار دیتے۔ یوں بغاوت وہیں دم توڑ جاتی۔

آئے روز کے حملے جہاں مبارک باد کا باعث بنتے وہاں بہادر اور سوگ وار گھرانوں کے لیے دُکھ اور غم کا سماں باندھ دیتے۔ ہر حملے کے بعد وہ بجھ جاتا۔ سوچوں کا دائرہ وسیع ہونے لگتا۔ اس کا جی چاہتا وہ سب کو بچا لے مگر یہاں اس کی فریاد سننے والا کوئی بھی نہ تھا۔ تھک ہار کے وہ بیٹھ جاتا، اور رونے لگتا۔ خدا سے اپنی اور دوسرے انسانوں کی مدد کے لیے مسیحا بھیجنے کی دُعا کرتا۔ اور اُسے روتے روتے یقین ہونے لگتا کہ وہ اس کی مدد کو ضرور کوئی مسیحا بھیجے گا۔

ایک روز وہ پہاڑی کے پار ندی سے پانی بھر رہا تھا۔ کہ اُسے اپنے قریب ایک آدمی دکھائی دیا۔ جو ایک تھکا ہار مسافر دکھائی دیتا تھا۔ وہ پانی کو یوں پی رہا تھا جیسے صدیوں کا پیاسا ہو۔ جیسے کئی میلوں کی مسافت طے کرتے کرتے پیاس سے اس کا حلق سوکھ گیا ہو۔ وہ اس کے بہت قریب تھا مگر اس کے باوجود اس کے اندر اس سے کسی بھی قسم کے سوال و جواب کی ہمت نہ تھی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کی مسلسل نگرانی ہو رہی ہے۔ اس لیے اگر انہوں نے اسے بات چیت کرتے دیکھ لیا تو اس کے ساتھ ساتھ مسافر کو بھی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ بہتری اسی میں جانی کہ چپ چاپ پانی بھرے اور اپنی راہ لے۔ عامر جو ایک مسافر کا روپ دھارے ہوئے تھا۔ اس بچے کے چہرے سے اس کے دل میں اپنے لیے اُٹھنے والی ہمدردی کو بھانپ گیا۔ اُسے یہ دوسروں سے منفرد نظر آیا۔ اس کے چہرے پر اُسے دُکھ، آس، امید بھی صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ اُسے بہت اچھا لگا۔ بے فکری کے اس دور میں فکر مندی نے اس کے اندر تجسس پیدا کر دیا اس سے رہا نہ گیا اور اُس نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

''کیا اکیلے ہو......''

وہ خاموش رہا۔ عامر نے پھر دوبارہ اپنا سوال دوہرایا۔ اب کی بار پھر اس کے چہرے پر پہلے جیسی خاموشی تھی اس نے تین چار بار اس سوال کو دوہرایا اور جب وہ نہ بولا تو کہنے لگا......

گونگا لگتا ہے بے چارا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ گونگا نہیں۔ اس لیے اپنے لیے اُٹھنے والی ہمدردی سے فائدہ اُٹھانے کی بجائے اُس نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

''ہم گونگا......نہیں......''

عامر نے جب دیکھا کہ یہ گونگا نہیں تو ایک اور سوال کر ڈالا۔

''کہاں سے آئے ہو؟''

اس نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

''پہاڑی کے پار سے......''

عامر کے دل میں اس کے لیے ہمدردی پیدا ہوئی۔ وہ اس کی مدد کرنا چاہ رہا تھا کیونکہ بالٹیوں کو دیکھ کر اُسے حیرت ہوئی کہ اتنے بڑے برتنوں کو وہ کیسے اُٹھائے گا۔ عامر جو خود بھی ایک پٹھان کا روپ دھارے ہوئے تھے بولا۔

تمہاری مدد کروں۔

اس نے صاف انکار کر دیا اور مزید کچھ کہنے سننے کی بجائے بالٹیاں اُٹھائیں اور پہاڑی کی طرف چل دیا۔ اُس کے قدم تیز تیز اُٹھ رہے

تھے۔اوراس کی وجہ سے اس کا پاؤں پھسل گیا۔مگراس کے گرنے سے پہلے ہی عامر نے اُسے سنبھال لیا۔

''بیٹا تم اکیلے کیوں آئے ہو؟......ابا کو ساتھ لے آتے یا کسی بھائی کو......''

عامر کی مدد نے اس کے دل میں چھپے خوف کو تھوڑا سا کم کیا۔اور پھراس کے لہجے نے اُسے بتادیا کہ وہ پٹھان نہیں وہ کبھی اس کے حلیے کو دیکھتا تو کبھی اس کے لب و لہجے پر غور کرتا۔

''ہم کیسے لاتا؟''

''کیا مطلب؟''

وہ گھبرا گیا

''کچھ نہیں......وہ ہم کو دیکھ رہا ہے......''

''کون وہ؟ مجھے بتاؤ شاید میں تمہاری مدد کرسکوں......''

''ہمارا کوئی مدد نہیں کرسکتا......تم جاؤ......''

اتنے میں آواز آئی۔

''جلدی آؤ......''

عامر کی نظر پڑی تو اُسے پہاڑی کے اوپر ایک آدمی کھڑا ہوا دکھائی دیا۔بہادر نے جلدی جلدی چلنے کی کوشش کی۔عامر نے بہادر کی بے گناہی ثابت کرنے کو کہا۔

''آپ کا بچہ گرنے لگا تھا......ہم نے بچالیا......''

جواب آیا۔

''تم چھوڑ دو......خود آجائے گا......''

بہادر ایک بار پھر اس کی شکل و صورت اور لب و لہجے میں تضاد پر حیران ہوا۔

بہادر تو آگیا مگر عامر کے ذہن میں بہت سے سوالات چھوڑ گیا۔مثلاً وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا تھا؟ کیوں کوئی اس کی مدد نہیں کرسکتا؟ وہ اکیلا کیوں تھا؟ وہ شخص اس کا کیا لگتا تھا۔آج رات بہادر بھی عامر کے بارے سوچتا رہا۔عامر کا لہجہ اس کے اور کمانڈر کے ساتھ مختلف کیوں تھا؟ اس کا حلیہ تو پٹھانوں کا سا تھا۔مگر زبان اُن جیسی نہ تھا۔سوچتے سوچتے وہ خوش ہوگیا۔

''شاید اللہ نے اُسے ہمارا مدد کے واسطے بھیجا ہے؟......وہ خود کو پٹھان دکھانا چاہتا ہے مگر پٹھان نہیں......اس نے ہمارے ساتھ اس لیے ایسا زبان میں بات کیا تا کہ ہم اس کو مشکل بتادے کمانڈر کے ساتھ اس لیے لہجہ مختلف تھا تا کہ وہ شک نہ کرسکے کہ وہ پٹھان نہیں......''

آج وہ بہت پرسکون نیند سونے جارہا تھا۔مسیحا کی آمد نے اس کی فکریں ختم کردیں۔



اسد گاڑی میں بیٹھا ہارن پر ہارن بجائے جا رہا تھا۔ ہارن کی آواز سے اس نے سارے گھر کو سر پر اُٹھا لیا۔ آمنہ بھی بھائی کو تنگ کرنے کے موڈ میں تھی۔ اس لیے اُسے تپانے کو ڈھیٹ بنی بیٹھی تھی۔ حالانکہ وہ بالکل ریڈی تھی۔ سکینہ نے جب دیکھا کہ اسد کے ہارن بجانے کے باوجود آمنہ کمرے سے نکلنے کا نام نہیں لے رہی تو کہنے لگی۔

''بیٹی جلدی آؤ بھائی بلا رہا ہے......''

ماں کو مطمئن کرنے کو بولی۔

''امی آئی......بس دو منٹ ایک کتاب نہیں مل رہی......''

سکینہ نے بیٹے کو تسلی دینے کو کہا۔

''ٹھہرو بیٹا......بہن کتاب ڈھونڈ رہی ہے......''

امی کا جواب سن کر تو وہ اور بھی کھلکھلا کے ہنسنے لگی۔ اس کی ہنسی تھی کہ رُکنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی آخر اس نے ایک چھوڑ دو لوگوں کو اپنی شرارت کا نشانہ جو بنایا ہوا تھا۔ وہ کمرے کا دروازہ کھولے گیراج میں دیکھ رہی تھی اور بھائی کو غصے سے ہارن بجاتے دیکھ کے تو اُس کی باچھیں اور بھی کھل گئیں۔

''آمنہ اگر تم پانچ منٹ کے اندر اندر نہ آئی تو میں تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا......''

دھمکی نے اُسے تھوڑا پریشان کر دیا۔ مگر ابھی بھی ستانے سے باز نہ آئی اور دروازے سے واپس آ کر بیڈ پر لیٹ گئی کہ اتنے میں سکینہ آئی۔ اُسے یوں لیٹا دیکھ کے کہنے لگی۔

''بہت بُری بات......بھائی کو یوں تنگ نہیں کرتے......جلدی سے بیگ اُٹھاؤ اور جاؤ......''

تب تک اسد بھی آ گیا۔

''چڑیل مجھے تنگ کر رہی تھی میں تو یہ سمجھ رہا تھا واقعی کتاب گم ہو گئی ہے......''

''امی دیکھیں بھائی مجھے چڑیل کہہ رہے ہیں......''

اُس کے بار بار اسی الفاظ کو دوہرانے پر آمنہ نے خود کو defend کرنے کو کہا۔

''ایسی خوبصورت چڑیل آپ کو کہیں نہیں مل سکتی''

اسد کو جانے کی جلدی تھی اور وہ اس بحث میں پڑنے کے بالکل بھی موڈ میں نہ تھا۔

''آمنہ جلدی کرو......مجھے کہیں جانا ہے......''

آمنہ نے اسد کو یوں دیکھا جیسے اُسے اس کی حاضری کا علم ہو اور پھر وہ بھائی کے ساتھ جلدی سے گاڑی میں آ کے بیٹھ گئی۔ اور جب کالج گیٹ پر اسد نے اُسے اُتارا تو جاتے جاتے کہنے لگی۔

''بھائی صائمہ کو میرا اسلام کہیے گا......''

اُس نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

''کون صائمہ......؟ کیسی صائمہ؟......میں کسی صائمہ کو نہیں جانتا......''

''چلیں آپ کہتے ہیں تو یقین کر لیتی ہوں......''

وہ مسکرا دیا۔ کالج میں داخل ہوتے ہی اس کی سب فرینڈز اُس سے اس کی شرارتوں کے بارے پوچھنے لگی۔ وہ روز اپنی اور اسد کی شرارتوں کی کہانی سنا کے ان کو ہنسایا کرتی تھی۔ اور وہ بھی اب اس کی کہانی سنے بغیر نہ رہتی تھیں۔ اور جب اس نے انہیں آج کی شرارت کے بارے بتایا تو سب ہنسنے لگیں۔ اس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیل گی۔ اتنے میں رفعت کمرے میں داخل ہوئی۔ اُسے مسکراتا دیکھا تو کہنے لگی۔

''بہت بُری بات بیٹی......شاہد بیٹا کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہے تم یہاں بیٹھی مسکرا رہی ہو''

آمنہ نے آنٹی کو سوری کہا اور تیزی سے بیگ اُٹھائے گیراج میں آ گی۔ اُسے آتے دیکھ کر شاہد نے چہرے پر سنجیدگی پھیلا دی اور لہجہ ذرا تلخ بنا لیا۔

''مس آمنہ میں کوئی فارغ انسان نہیں......آپ کو اپنے خیالوں کے سوا بھی کسی کی پرواہ ہے جب دیکھو اپنی دنیا میں مست رہتی ہیں......''

اُسے اپنی غلطی کا احساس تھا اس لیے وہ چپ چاپ اس کی ڈانٹ سن رہی تھی۔ پھر دونوں لائبریری کے لیے نکل پڑے۔ وہ خاموش تھی مگر شاہد چاہ رہا تھا کہ وہ کچھ بولے۔ اُسے اپنے رویے پہ افسوس تھا اور اس کی خاموشی کو اُسی کا سبب سمجھتے ہوئے اُس نے سوری بھی کہا۔

''ہمیں یوں اکٹھے آتے جاتے کئی دن گزر گئے، مگر آپ نے نہ کبھی میرے بارے پوچھا نہ اپنے بارے بتایا، ہمیشہ میری بات کو ہاں یا نہیں میں ختم کر ڈالا آخر بات کیا ہے؟ کیا آپ کو میرے ساتھ آنا پسند نہیں؟ اگر ایسی بات ہے تو آپ بلا تکلف بتا سکتی ہیں میں آپ کی بات کا بُرا نہیں مانوں گا۔''

''ایسی کوئی بات نہیں، ویسے بھی میں آپ کو اپنے بارے کیا بتاؤں۔ میری زندگی کی کتاب میں جتنے اوراق لکھے ہیں وہ عامر بھائی آپ کو پڑھ کے سنا چکے ہیں......جب کوئی نیا ورق شامل ہوگا میں آپ کو پڑھ کے ضرور سناؤں گی......''

گفتگو کے اس تسلسل کو قائم رکھنے کو بولا۔

''آپ میرے بارے بھی تو پوچھ سکتی ہیں......''

''مجھے دلچسپی نہیں......''

اس نے جواب دیا۔

''مگر مجھے ہے......''

''کیوں؟......''

''اس لیے کہ میں آپ کی زندگی میں اپنا ایک مقام چاہتا ہوں......ویسا جیسا آپ نے اپنے رشتوں کو دیا۔''

''کیا مطلب؟''

''آپ زندگی کے اس سفر میں میرا ہاتھ پکڑ کے چلنا چاہیں گی، پلیز انکار مت کیجیے گا......''

آمنہ سنجیدہ ہوگئی

''مجھے کسی ہاتھ کی ضرورت نہیں، میں تنہا سفر کرنے کی عادی ہوگئی ہوں......''

''پلیز......اسد کی خاطر......''

وہ غصے میں آ گئی۔

''شاہد صاحب مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش مت کریں، اگر آپ نے اس قسم کی گفتگو ترک نہ کی تو میں آپ کے ساتھ یہ تھوڑا سا سفر بھی طے کرنے سے انکار کر دونگی......''

''مگر میں آپ کو ایسا ہرگز نہیں کرنے دونگا......''

اب شاہد بولتا جا رہا تھا۔ مگر اس نے جواب دینے سے انکار کر دیا۔ اُس کا بڑے سے بڑا جوک بھی آمنہ کو ہنسانے میں ناکام رہا۔ آمنہ اس کی عادی ضرور ہو چکی تھی تبھی تو اس کی دھمکی پہ اس نے کوئی بھی جواب دینے سے انکار کر دیا۔ اور اس کی وجہ شاہد کا اس کی مدد کرنا اس کا ہر طرح سے ساتھ دینا اس کی پرواہ کرنا۔ اس کی اہمیت کا احساس دلانا۔ اپنی زندگی میں اس کا مقام بنانا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی اگر وہ نہ ہوتا تو شاید وہ سب نہ کر پاتی جس کو وہ کرنا چاہتی تھی۔

لائبریری سے واپسی پر آمنہ نے صائمہ کے گھر رُکنے کا کہا تو وہ اُسے صائمہ کے گھر چھوڑ گیا۔ آمنہ کے لاکھ منع کرنے کے باوجود شاہد نے اُسے کل یہیں سے پک کرنے کا کہہ دیا۔ اور خدا حافظ کہتے ہوئے چلا آیا۔ آمنہ کو یوں اچانک دیکھ کر صائمہ تو جو خوش ہوئی سو ہوئی بشریٰ کو بھی دلی مسرت ہوئی۔ اور جب اُس نے رات یہیں رُکنے کا بتایا تو صائمہ تو خوشی سے اُچھلنے لگی۔ بشریٰ نے آمنہ کی پسند کا کھانا تیار کیا۔ دونوں رات بھر باتیں کرتی رہیں۔ ان کی ہر بات ماضی کی یاد سے شروع ہو کر ماضی کی یاد پر ختم ہو جاتی کبھی وہ مسکرانے لگتیں تو کبھی اُداس ہو جاتیں۔ باتوں باتوں میں آمنہ نے آنٹی کی خواہش کا تذکرہ بھی کیا مگر صائمہ نے اس پر کان ہی نہ دھرے۔ باتوں باتوں میں آمنہ نے شاہد کا بھی ذکر چھیڑا۔ اس کی ہر بات سے صائمہ کو یہ ہی اندازہ ہوا کہ وہ اُسے اپنا ایک محسن سمجھتی ہے۔ وہ اس کے لیے ایک جگنو ہے جس نے اُس کی اندھیری راہوں میں روشنی پھیلائی ہے۔ اور انہی راہوں پر چلتے ہوئے وہ ایک روز ایسی منزل پر پہنچنے کے بارے پُر امید تھی جہاں صرف وہ دوسروں کے لیے خوشیاں خرید سکے گی۔ اُن کی اداسیوں، غموں، دُکھوں اور مشکلوں کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کو روک سکے گی۔ آنے والے سیلاب کے سامنے بند باندھ دے گی۔ آمنہ نے کہا

''صائمہ وہاں صرف روشنیاں ہی روشنیاں ہوں گی، کوئی بھی اپنے بھائی، شوہر یا کسی دوسرے رشتے کے لیے نہیں روئے گا، میں کامیاب ہوں گی، میں کامیاب ہوں گی......''



قاری صاحب نے اورنگ زیب اور دوسرے ہم اثر لوگوں کے تعاون سے جو تبلیغی گروہ بنائے وہ دن بدن کامیاب ہو رہے تھے۔ انہوں نے اپنی تبلیغ سے کئی نوجوانوں کو جہاد کے لیے آمادہ کیا۔ آئے دن دھماکوں کی خبروں سے لوگوں میں پھیلے خوف و ہراس کا سہرا انہی کے سر تھا۔ مگر اب خوف و ہراس اس قدر بڑھ گیا کہ لوگوں نے اپنے بچوں کو گھروں میں قید کر لیا۔ نوجوانوں کا باہر نکلنا کم ہوا تو تبلیغی گروہوں کی ناکامیاں شروع ہوئیں۔ مجاہدوں کی تعداد کم ہونے لگی۔ پہلے لوگ جہاں کسی کو اسلام کے بارے بات کرتے سنتے فوراً وہاں پہنچ جاتے مگر اب وہ تبلیغی لوگوں سے خائف ہونے لگے تھے جہاں مولانا ٹائپ کے لوگ دیکھتے فوراً بھاگ کھڑے ہوتے۔

"نکلو یار یہاں سے...... یہ دہشت گرد ہیں ہمارا بھی دماغ خراب کر دیں گے"

جہاد کا نام سنتے ہی لوگوں کے ذہنوں میں فوراً دہشت گردوں کا نقشہ آ جاتا۔ مجاہدوں کی تعداد سکڑنے کا مطلب تھا اورنگ زیب کی آمدن میں کمی جو اُسے کسی صورت منظور نہ تھی۔ لہٰذا اب وہ غنڈہ گردی پر اُتر آئے۔ ان کا کام صرف زبان سے اُنہیں قائل کرنا ہی نہ تھا۔ بلکہ انکار کرنے والے گھرانوں سے زبردستی ایک نہ ایک فرد کو اپنے ساتھ شامل کرنا بھی تھا۔ اس کے ساتھ اُنہوں نے بھوک پیاس کے مارے مجبور لوگوں کو بھی خریدنا شروع کر دیا۔ یہ خرید و فروخت اور غنڈہ گردی تو پہلے بھی تھی مگر اب غنڈہ گردی بڑھنے کے ساتھ قیمت خرید میں بھی اضافہ کر دیا گیا۔ تاکہ فروخت میں اضافہ ہو۔ جن گھروں میں اُنہیں غربت ڈیرے ڈالے نظر آتی وہاں پہنچ جاتے۔ ان کے تبلیغی جملے ایسے لوگوں پر گہرا اثر چھوڑتے اور اگر نہ بھی چھوڑتے تو گھر کا کوئی نہ کوئی فرد ضرور جان کی قربانی کو تیار ہو جاتا تاکہ وہ باقی کے افراد کو مرنے سے بچا سکے۔ جہاد کو دین کی خدمت سمجھ کے اس گروہ کا حصہ بننے والے جب ان کے ساتھ شامل ہوتے تو ان کا ذہن بدل جاتا۔ خود کو غلط تصور کرتے مگر اب ان کے پاس نہ تو واپسی کا راستہ تھا اور نہ ہی اُنہیں کوئی واپس جانے کی اجازت دے سکتا تھا۔ البتہ مجبوریوں کے تحت بکنے والے اپنے عمل کو درست تصور کرتے۔

عامر پٹھان کا روپ دھارے۔ ان دہشت گردوں کی تلاش میں یہاں کی خاک چھان رہا تھا۔ بہادر نے اُسے کئی بار دیکھا مگر کچھ کہنے کی جرأت نہ کر سکا۔ دن بدن وہ بہادر کے دل میں گھر کرتا جا رہا تھا۔

اس سے جب عامر نے پوچھا۔

"تم روز پانی بھرنے آتے ہو"

تو اُس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"جی......"

"مگر کیوں؟"

اُس کے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"سزا کے طور پر......"

عامر حیران ہوا۔

''سزا.....کیسی سزا؟''

''ان کی بات نہ ماننے کی.....''

''کونسی بات؟''

اُسے لگا کہ کوئی سن رہا ہے اس لیے اس کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ عامر نے اس کا اعتماد بحال کرنے کو کہا۔

''چند دن قبل تم نے کہا تھا وہ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ مجھے بتاؤ کون تمہیں دیکھ رہا ہے؟..... بہادر تم معصوم اور پیارے ہو، میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں، مگر اس کے لیے مجھے تمہاری ضرورت ہوگی، جب تک تم مجھے اپنے بارے میں نہیں بتاؤ گے میں یہ نہیں کرسکتا''

بہادر پہلے جان چکا تھا کہ وہ مسیحا ہے اب تو اُسے پورا یقین ہوگیا۔

''آپ صرف ہمارا مدد کرے گا یا دوسروں کا بھی؟''

عامر نے اُسے جواب دیا۔

''میں سب کی مدد کرنا چاہتا ہوں.....''

''ٹھیک ہے ہم تمہیں ضرور بتائے گا.....''

اتنا کہہ کے بہادر چلا گیا عامر آج بہت خوش تھا کئی دنوں کی کوشش کے بعد آخر وہ اس کا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ جہاں اُسے خوشخبری ملی وہاں ماں کی بیماری کے بارے خبر نے اُسے اُداس بھی کر دیا۔ اُسے واپس آنا پڑا۔ جب وہ ہسپتال پہنچا تو آمنہ کے ساتھ شاہد کو بھی وہاں پا کے بہت خوش ہوا۔ اُس نے اس مشکل گھڑی میں آمنہ کا ساتھ دینے پر اس کا شکریہ ادا کیا۔ ایک دو روز ہسپتال میں گزارنے کے بعد وہ رفعت کو گھر لے آئے۔ بیماری کے دوران آمنہ نے رفعت کی بہت خدمت کی۔ حتیٰ کہ اُس نے لائبریری جانا بھی چھوڑ دیا تاکہ کسی قسم کی تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ عامر نے بہت کہا کہ وہ موجود ہے دیکھ بھال کرے گا مگر وہ نہ مانی۔ پھر شاہد نے بھی آمنہ کو گھر پر ہی رہنے کا مشورہ دیا۔ اب وہ اُسے لائبریری کے لیے لینے تو نہ آتا مگر رفعت کی عیادت کو بلا ناغہ آتا۔

جوں ہی وہ گھر میں قدم رکھتا پورا گھر قہقہوں سے گونج اُٹھتا۔ سب کو لطیفے سنا سنا کے خوب ہنساتا۔ بات بے بات اُسے کوئی نہ کوئی لطیفہ یاد آ ہی جاتا۔ باتوں باتوں میں پاگلوں کے بارے بات ہونے لگی تو شاہد نے کہا۔

''آنٹی اسی بات پر میں آپ کو لطیفہ سناتا ہوں۔ ایک پاگل بیٹھا خط لکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے پوچھا بھائی کیا کر رہے ہو۔ تو کہنے لگا خط لکھ رہا ہوں۔ پوچھا کس کو لکھ رہے ہو؟ تو جواب دیا خود کو۔ ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے پوچھا اچھا بتاؤ کیا لکھا ہے؟ تو معلوم ہے اُسے کیا جواب دیا..... خط ملے گا تو پتہ چلے گا نا!''

سب ہنس دیے۔ سب کے مسکراتے چہروں کو دیکھ کر اُسے بہت خوشی ہوئی۔ اُسے جہاں اس بات کی خوشی تھی کہ وہ ایک بیمار کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر رہا ہے اس کی تکلیف کم کر رہا ہے وہاں اُسے آمنہ کے ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ کی بھی مسرت تھی۔ شاہد کی محبت دن بدن بڑھ رہی تھی۔

آمنہ کو اس بات کی خوشی نہ تھی بلکہ وہ اسے روکنے کی کوشش میں لگی رہتی اور اسی سبب اُس کے سامنے کم سے کم آتی اور اگر آتی بھی تو زیادہ تر سنجیدہ ہی رہتی۔ مگر اُس کے لطیفوں پر اُس کی بے اختیار ہنسی نکل آتی۔ اس لیے اُس نے وہاں سے اُٹھنے کا سوچا۔ اور جب شاہد کو اس کی بھنک پڑی تو بولا۔

''ارے آپ کہاں چلی......''

اُس نے بہانہ بنایا۔

''میں چائے بنانے کچن میں جا رہی ہوں......''

شاہد نے فٹ سے جواب دیا۔

''آپ کو کس نے کہا ہمیں چائے کی طلب ہو رہی ہے؟ چائے تو پیتے ہی رہتے ہیں آپ محفل اُجاڑ کے مت جائیں...... کیوں آنٹی میں نے ٹھیک کہا نا!''

رفعت نے اس کی تائید کی عامر نے بھی ماں اور دوست کی ہاں میں ہاں ملا دی۔

وہ کسی نہ کسی بہانے وہاں سے اُٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر ہر بار شاہد اس کی کوشش کو ناکام بنا دیتا۔ اب کی بار اس نے کہا۔

''ارے آپ کہاں چلی...... بیٹھیے میں آپ کو ایک سمجھ دار لطیفہ سناتا ہوں......''

رفعت نے حیرت زدہ ہو کے پوچھا۔

''شاہد بیٹا لطیفے بھی سمجھ دار ہوتے ہیں......''

''جی آنٹی لطیفے ہوتے تو ہمارے ہنسنے کو ہیں مگر ان میں ہمارے لیے سبق بھی ہوتا ہے...... مگر ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہمیں سمجھ وقت گزرنے کے بعد آتی ہے......''

عامر نے کہا۔

''یار اب سنا بھی چکو کہ یوں ہی سسپنس کریٹ کرتے رہو گے''

''تو پھر سنیں...... ایک پٹھان بہت تیز بائیک چلائے جا رہا تھا راستے میں اُسے ایک سردار ملا۔ سردار نے پوچھا۔ اتنی تیز کیوں جا رہے ہو؟ تو پٹھان کہنے لگا۔ ایک ارجنٹ لیٹر پہنچانا ہے۔ سردار نے پوچھا کہاں؟ تو پٹھان نے جواب دیا پڑھنے کا ٹائم نہیں......''

سب ہنسنے لگے تو شاہد نے کہا۔

''یہ تو سنیں سردار نے کیا کہا۔''

عامر نے پوچھا۔

''کیا؟''

تو شاہد ہنستے ہوئے بولا۔

''سردار کہنے لگا.....Then go fast''

مگر اس سے پہلے کہ وہ سمجھداری کے بارے سوال کرتے شاہد نے ایک اور لطیفہ سنانا شروع کیا۔

''ایک درخت پر بندر بیٹھا تھا کہ پٹھان بھی اس درخت پر چڑھ آیا۔ بندر نے پٹھان سے پوچھا بھائی تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ پٹھان نے جواب دیا۔ ہم سیب کھانے آیا ہے۔ بندر بڑا حیران ہوا۔ مگر یہ تو آم کا درخت ہے۔ پٹھان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ہم سیب ساتھ لایا ہے۔''

ایک اور سنیں۔ ایک پٹھان میاں بیوی ریلوے اسٹیشن پر کھڑے ٹرین کا انتظار کر رہے تھے کہ ایک ٹرین آئی جس پر لکھا تھا Mail Train۔ پٹھان جلدی سے ٹرین پر سوار ہو گیا اور بیوی سے کہنے لگا۔ جب فی میل ٹرین آئے گا تو تم بھی آ جانا......۔

ہنس ہنس کے سب کے پیٹ میں بل پڑ گئے...... رفعت نے کہا۔

''ارے بیٹا اب بس کرو...... اب اور ہنسنے کی ہمت نہیں......''

آمنہ نے سوال کیا۔

''اس میں سمجھداری کہاں تھی؟''

شاہد کہنے لگا۔

''ان لطیفوں سے ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سردار اور پٹھان بہت احمق ہوتے ہیں''...... عامر نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ اگر یہ لوگ احمق نہ ہوتے تو نہ ہندو سرداروں کو استعمال کر کے فائدہ اُٹھاتے۔ اور نہ پٹھان آلہ کار بنتے۔ ہمارے ملک کا امن و امان تباہ کرنے کے لیے ملک دشمن عناصر انہی کو تو استعمال کر رہے ہیں...... مگر انہیں اس بات کا علم ہی نہیں......''

رفعت نے کہا۔

''اس لیے تو بڑوں کا قول ہے دانا دشمن نادان دوست سے بہتر ہے...... یہ ہمارے نادان دوست ہے۔''



بہادر کئی دنوں سے عامر کا انتظار کر رہا تھا مگر اس کی کوئی خبر نہ تھی۔ اس کی راہ تکتے تکتے وہ مایوس اور نا امید ہو چکا تھا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آتے۔ کبھی سوچتا قسمت صرف اُسے آس دلا رہی تھی۔ کبھی خیال آتا کوئی اس کی مدد نہیں کر سکتا۔ اپنے حالات پر صابر و شاکر ہونے کا فیصلہ کرتا تو بے چینی ہونے لگتی۔ دل میں خلش بڑھ جاتی۔ اور پھر سے خواہش جاگ اُٹھتی کہ وہ یہاں سے نکلے دوسروں کی مدد کرے۔ انہیں موت کی اندھیر نگری میں جانے سے بچائے۔ مگر وہ کچھ نہ کر پاتا وہ بہت دُکھی ہو کے اکبر سے کہنے لگا۔

''ہم ظلم کر رہے ہیں، بے گناہوں کو مار رہے ہیں، چلو یہاں سے بھاگ چلیں......''

مگر اکبر نے کہا۔

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے...... یہاں سے نکلنے کا مطلب ہے جنگ میں پیچھے ہٹنا یعنی کافر کی موت مرنا......''

اس کے جواب نے اُسے خاموش کر دیا وہ جان گیا کہ کوئی بھی اس کی بات نہیں سنے گا۔ سب یہ بات دل و دماغ میں بٹھا چکے ہیں کہ وہ نیک کام کر رہے ہیں۔ مگر اُسے اُن کی ذہنیت پر اس لیے افسوس نہ ہوتا کیونکہ اُن کے ذہنوں میں یہی ڈالا گیا تھا۔ اور اس کی مکمل یقین دہانی کروائی گئی تھی کہ وہ نیک کام کر رہے ہیں۔ اُس کا جی چاہتا کہ وہ خود پڑھے اور جانے کیا سچ ہے وہ جو دل کہہ رہا ہے یا وہ جو اُن کے ذہنوں میں ڈالا جاتا ہے۔ مگر کتابیں اس کے پاس نہ تھیں۔ ایک عامر تھا جس سے وہ پوچھ سکتا تھا مگر وہ بھی اُمید کی ایک کرن بن کر آیا اور نا اُمیدی کا اندھیرا چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ بھاگنا چاہتا تھا دور بہت دور جہاں امن و امان ہو۔ لوگوں کی آہیں اور سسکیاں نہ ہوں۔

اُس کا حال غیر ہوتا دیکھ کر گل خان نے اُسے جسمانی اذیت دینے کے بارے سوچ لیا۔ ابھی تک وہ یہ سوچ کے اُسے معاف کیے ہوئے تھا کہ وہ بدل جائے گا۔ بہادر جیسے بچوں کی اُسے اشد ضرورت تھی۔ بہادر جو دوسروں کی جان لینے کے ہر وقت تیار تھا اب ڈرنے لگا تھا جو انہیں قطعی منظور نہ تھا۔



آصف نے بھی اب اجمل اور کاشف کے ساتھ مل کر اسلام کے بارے جاننے کا ارادہ کیا۔ بہادر نے ان کے دلوں میں اس خواہش کو جنم دیا تھا۔ وہ ہر اس وجہ کا کھوج لگانا چاہتے تھے جس کی بنا پر ان کا ملک اس دلدل میں دن بدن گرتا جا رہا تھا۔ وہ ذہنوں میں اُبھرنے والے سوالات کو لکھ لیتے اور پھر ان کے جوابات کے لیے مولانا صاحب کے پاس جاتے پھر خود اس کے بارے پڑھتے قرآن پاک کھولتے۔ غرض ہر لحاظ سے اس کے بارے ٹھوس جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتے۔

گریجوایشن کے بعد صائمہ نے پڑھائی کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ اسد کے مرنے کے بعد وہ بہت اُداس رہنے لگی تھی اور اس کی تنہائی میں اضافہ آمنہ کے دور جانے سے مزید ہو گیا۔ اب اس کا کسی شے میں بھی جی نہ لگتا۔ ٹی۔ وی دیکھنا بالکل ختم کر دیا۔ بشریٰ ہر وقت اُسے اداس اور کھویا کھویا دیکھ کے دُکھی رہتی تھی۔ اگر وہ شادی کو مان جاتی تو نہ صرف ان کے دُکھوں میں کمی واقع ہو جاتی بلکہ صائمہ کی تنہائی بھی ختم ہو جاتی مگر وہ اس کے لیے تیار ہی نہ تھی۔ البتہ ماں باپ کے دُکھ کو کم کرنے کے لیے اُس نے خود کو مصروف رکھنے کے بارے سوچا۔ اس کے لیے جو پلان اس کے ذہن میں آیا وہ

کالج میں ایڈمیشن کا تھا۔ کالجز کو یورنیورسٹیز کا درجہ ملنے کی وجہ سے اُسے اور بھی آسانی ہوگئی اس لیے اُس نے قریب ترین کالج کا انتخاب کرلیا کیونکہ یونیورسٹی اس کے گھر سے کافی دور تھی۔

آصف بھی اسی کالج میں ایم۔ایس۔سی۔اکنامکس پارٹ ٹو کا طالب علم تھا۔اس کے اکثر دوست اس کے سامنے کھوئی لڑکی کا ذکر کرتے رہتے تھے مگر اُسے اس بات میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ایک روز آصف دوستوں کے ساتھ کیفے ٹیریا میں بیٹھا تھا کہ پھر اُنہوں نے اس کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ اُس نے اُنہیں منع بھی کیا مگر وہ باز نہ آئے۔اتنے میں تین چار لڑکیاں کیفے ٹیریا میں داخل ہوئیں۔اور ان کے سامنے والی ٹیبل پر آبیٹھیں۔وہ سب محو گفتگو تھیں کہ آصف کی نظر اُن میں سے ایک لڑکی پہ پڑی جو اردگرد سے بے نیاز ہنسی مذاق سے لاپرواہ ہو کے اپنی ہی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔وہ اُسے دیکھ ہی رہا تھا کہ اس کے کانوں میں آواز آئی۔

''مس کھوئی کھوئی نکل آؤ اپنی دنیا سے اردگرد دیکھو یہ دنیا بہت حسین ہے......کم از کم تمہاری دنیا سے زیادہ......''

اس کے چہرے پر اس کی آنکھوں میں اُسے سمندر کی طرح گہری اُداسیاں نظر آئیں۔وہ ایسی اُداسیاں تھیں جنہوں نے اُسے زخمی کردیا تھا۔وہ ایک گھائل پرندے کی طرح گری ہوئی تھی۔آصف دوستوں کے پاس سے اُٹھ کے ان کی ٹیبل پر آ گیا یہاں ایک کرسی خالی تھی اس لیے اُسے بآسانی جگہ مل گئی۔

بیٹھتے ہوئے بولا۔

''ہیلو......''

سب اُسے دیکھ کے بولیں۔

''جی مسٹر......آپ یہاں کیسے؟''

''بتاتے ہیں......بتاتے ہیں......بیٹھنے تو دیں''

''مسٹر آپ خیر سے بیٹھ چکے ہیں......آنے کا مقصد بیان کریں......''

سب ہنسنے لگیں۔

''میرا نام آصف ہے......''

''اچھا تو آپ ہیں ہمارے کالج کے لائق فائق سٹوڈنٹ۔جن کے کالج میں چرچے ہیں......''

''چرچے۔کیسے چرچے؟''

''اچھا! اب زیادہ عاجز بننے کی ایکٹنگ مت کریں......''

آصف کا مقصد کچھ وقت گزارنا تھا۔اس لیے باتوں میں سب کو اُلجھا لیا۔سب بڑھ چڑھ کے اُس کی باتوں کا جواب دے رہی تھیں مگر صائمہ خاموش بیٹھی تھی۔کچھ دیر بعد آصف نے اُس کے منہ سے صرف یہ جملہ سنا۔

''کلاس کا ٹائم ہو گیا ہے......''

یہ سنتے ہی سب نے کتابیں سمیٹیں۔ اور خدا حافظ کہہ کے وہاں سے اُٹھ گئیں۔

اب وہ وہاں اکیلا تھا۔ باقی کے دوست بھی اُٹھ کر اُس کے پاس چلے آئے۔ سب اُسے تنگ کرنے لگے مگر اُس نے اُنھیں یہ کہہ کے خاموش کرا دیا کہ ''تم لوگ غلط سوچ رہے ہو......''

اب سے اس کا مقصد اس کے بارے جاننا تھا۔ چند ہی دنوں کی کوشش سے وہ اس کے بارے سب کچھ جان گیا۔ اس کے بارے جاننے کے بعد اس کے دل میں دہشت گردوں کو بے نقاب کرنے کی خواہش اور بھی بڑھ گئی۔ ماں کے صحت یاب ہوتے ہی عامر نے دوبارہ سے کام شروع کر دیا۔ آمنہ بھی اپنی روٹین پر واپس آ گئی۔ شاہد کی محبت دن بدن پروان چڑھنے لگی آمنہ کا خشک رویہ بھی اس کی راہ میں حائل نہ ہو سکا۔ وہ اُسے محبت کا احساس دلانے کی بہت کوشش کرتا مگر ہمیشہ اُسے یہ ہی الفاظ سننے کو ملتے۔

''میں ایسا کوئی رشتہ استوار کرنے کے حق میں نہیں...... جب خون کے رشتے چھن سکتے ہیں تو......''

وہ اُسے سمجھاتا۔

''وہ سب قسمت کا لکھا تھا...... قسمت کے لکھے کو کوئی نہیں ٹال سکتا...... وہ تمہیں چھوڑ کے نہیں گئے وہ تو تمہارے ساتھ ہیں اور ہمیشہ رہیں گے''

مگر اس کا خیال تھا کہ وہ جس رشتے کو بھی قائم کرے گی وہ ٹوٹ جائے گا۔ اُس نے کہا۔

کیوں اندیشوں سے ہم ڈرتے ہیں
یہ سچ ہے کہ اندیشے ہی سچ ہوا کرتے ہیں

اُسے یوں اُداس اور غمگین دیکھ کر شاہد نے اُسے گھر لے جانے کا سوچا۔ آمنہ نے بہت بہانے بنائے مگر اُس نے اس کے بہانوں کو صرف بہانہ ہی سمجھا اور اُسے گھر لے آیا۔ آمنہ کو گھر پر دیکھ کے عفت بہت خوش ہوئی اور کہنے لگی۔

''بیٹا یہ تم نے بہت اچھا کیا جو آمنہ کو گھر لے آئے...... ذرا دل بھی بہل جائے گا اور مجھے بھی کمپنی مل جائے گی۔''

آمنہ مسکرائی۔ عفت نے اُسے پیار کرتے ہوئے شاہد سے کہا۔

''اب جلدی سے آمنہ کو گھر لے آؤ...... ہمیشہ ہمیشہ کے لیے...... تا کہ اس گھر میں بھی رونق آ جائے۔''

شاہد کو یوں لگا جیسے اُس کے دل کی بات کہہ دی ہو۔ مسکرا دیا۔ عفت انہیں ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کا کہہ کے خود کچن میں چائے بنانے کے واسطے چلی آئی۔ آمنہ نے بہت منع کیا مگر وہ کہنے لگی۔

''بیٹی بچوں کے لیے ایسی تکلیف کرنے سے والدین کو خوشی ملتی ہے۔ تم مجھ سے میری خوشی چھیننا چاہتی ہو......'' ان کا جواب سن کر آمنہ کو شرمندگی ہوئی اور سوچنے لگی کہ وہ کس قدر خشک مزاج، خود غرض اور بے حس ہے اُسے اپنی خوشی کے علاوہ کسی کی کوئی پرواہ نہیں۔ مگر پھر یہ کہہ کے دل کو دلاسا دینے لگی کہ وہ تو سب کو خوشیاں دینا چاہتی ہے مگر وہ ایسا کر نہیں پاتی تو اس میں اس کا کیا قصور۔ وہ صوفے پر بیٹھی انہی باتوں

کو سوچ رہی تھی اور شاہد اُسے دیکھ رہا تھا۔

''جانے وہ دن کب آئے گا؟ جب تم بھی مجھے یوں ہی چاہو گی جیسے میں تمہیں چاہتا ہوں...... تمہیں بھی میری پرواہ ہوگی میری خوشی کا احساس ہوگا''

جب عفت آئی تو دونوں کو گم سم دیکھ کے کہنے لگی۔

''بچے تو شور مچا مچا کے آسمان سر پر اُٹھا لیتے ہیں، اور ایک تم لوگ ہو گم صم بیٹھے ہو......''

شاہد نے کہا

''ماں جی میں تو ایسا ہی کرتا...... مگر کیا کروں ساتھی ہی ساتھ دینے کو تیار نہیں......''

آمنہ نے جلدی سے بات بدلی۔

''آنٹی اب اجازت دیجیے......''

''ارے ارے...... ایسے کیسے جانے دوں میں بیٹی کو...... بیٹھو مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنا ہے......''

عفت نے اُسے نوٹ کرنے کے بعد یہ محسوس کیا کہ وہ بالکل پہلے جیسی ہے اُس میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی بس اب اُس نے دوسروں کے سامنے آنسو بہانہ بند کر دیا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلی اُداسی کو دیکھتے ہوئے اُس نے اُسے اپنی کہانی سنائی جو آج تک اُس نے بیٹے سے بھی چھپا رکھی تھی مگر اب اُسے محسوس ہوا تھا کہ اُسے یہ سب کہہ ڈالنا چاہیے جو دل میں ہے۔

نعیم عفت کا اکلوتا بھائی تھا سب کی آنکھ کا تارا اور اس کی وجہ صرف اس کا اکلوتا ہونا ہی نہیں تھا۔ بلکہ اس کی عادات وخصائل نے اُسے سب کے دلوں میں ایک خاص مقام دے رکھا تھا۔ والدین دوست، اساتذہ سب اُسے بہت چاہتے۔ اس وقت وہ میٹرک کا طالب علم تھا جب وہ ایک روز اپنے دوست کے ساتھ کسی کام کی غرض سے گھر سے گیا اور پھر واپس اُس کی میت آئی۔ وہ مر گیا اور اس کا دوست ہمیشہ کے لیے پاگل خانے میں جا بیٹھا۔ ہوا یہ کہ دونوں دوست سیر کرتے کرتے نہر پر پہنچ گئے۔ نہر کو دیکھتے ہی نہانے کا خیال آیا اور اس غرض سے نہر میں کود گئے مگر نہاتے ہوئے اچانک نعیم گہرے پانی میں چلے گیا ایک بڑی سی لہر آئی اور وہ ڈوب گیا۔ دوسرا دوست اچھا تیراک تھا لہٰذا وہ بچ گیا مگر خود کو دوست کی موت کا ذمہ دار سمجھتے ہوئے ذہنی توازن کھو بیٹھا۔ والدین بیٹے کی اچانک موت کا صدمہ برداشت نہ کر سکے اور اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ عفت اب تنہا رہ گئی۔ چچا نے ترس کھایا اور اپنے پاس لے گیا مگر وہاں بھی اُسے اذیت بھری زندگی کا سامنا رہا اور پھر جب شادی ہوئی تو بارہ سال بعد ہی شوہر اس دنیا سے چل بسا۔

عف نے نم آنکھوں سے یہ کہانی سنائی مگر مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔

''مگر بیٹی میں اتنے غموں کے باوجود آج بھی زندہ ہوں...... اپنے بیٹے کے لیے...... اس کی خوشی کے لیے......'' ماں کی روداد سن کے شاہد نے کہا۔

''امی آپ نے پہلے کبھی نہیں بتایا......''

وہ مسکرا دی۔ آمنہ اس عورت کی ہمت اور حوصلے کو داد دے رہی تھی جس نے اتنی تکلیفوں کے باوجود اپنے آپ کو زندہ رکھا اپنے بچے کی خاطر اپنے دُکھوں کو سینے میں دفن کر دیا۔ وہ خود کو کوس رہی تھی جو سب کے چہروں کی اُداسیوں کی وجہ تھی اُن کے لیے مصیبت بن چکی تھی۔ خود کو اس ندامت بھرے خیالات نکالنے کے لیے اُس نے وہاں سے چلنا مناسب سمجھا اور خدا حافظ کہتے اُٹھ گئی۔

شاہد اُسے گھر ڈراپ کرنے کی غرض سے اُس کے ساتھ چلا آیا اور جب گاڑی اس کے گیٹ کے سامنے رُکی تو اُس نے کہا۔

''آمنہ تمہارے ساتھ بہت سوں کی خوشیاں وابستہ ہیں......''

آمنہ پہلے ہی کافی شرمسار ہو رہی تھی جواب دیا۔

''I will try مگر اگر کبھی میں آپ لوگوں کے لیے دُکھ کا باعث بنوں تو پلیز مجھے معاف کر دیجیے گا۔''

اس کا اتنا کہہ دینا ہی شاہد کے لیے کافی تھا۔



عامر کو جوائننگ کے بعد کسی دوسرے ایریا میں جانے کا کہا تو اُس نے بہادر کا سوچ کے اُسی علاقہ میں جانے کی ضد کی۔ وہ جلد از جلد بہادر سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بہادر مایوس ہو چکا ہوگا۔ مزید تاخیر اس کے لیے کئی اندیشے پیدا کر سکتی تھی۔ گل خان نے بہادر کی سزا میں اضافہ کر دیا گیا۔ کئی دن اُسے کھانے کو سارے دن میں صرف ایک روٹی ملتی رہی جس کی وجہ سے وہ کافی کمزور ہو گیا تھا۔ ہنٹروں نے تو اس کی حالت کافی خراب کر دی۔ کئی دن اُسے قید میں بھی رکھا گیا اور پھر جب اُنہیں محسوس ہوا کہ اس کے اندر پہلے والی تبدیلی آ گئی ہے تو دوبارہ پانی بھرنے کی سزا تجویز کر دی گئی۔ تاکہ اگر بغاوت کا ذرا سا بھی اثر رہ گیا ہو تو نکل جائے۔ عامر نے جب اُسے دیکھا تو پہچان ہی نہ پایا۔ مگر جب وہ اس کے قریب آیا تو اُس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

''بہادر تم...... یہ تمہاری کیا حالت ہو گئی ہے؟ کس نے یہ سب کیا ہے؟...... بتاؤ...... بتاؤ......''

پھر بہادر نے اپنے اوپر بیتنے والی ایک ایک زیادتی کے بارے بتایا۔ اس کے علاوہ اپنے اور اُن کے بارے بھی اُسے آگاہ کر دیا۔ عامر کو پہلے ہی شک تھا اب یقین ہونے کے بعد اُنہوں نے مل کر ایک منصوبہ تیار کیا۔ بہادر نے گل خان کو یہ خوشخبری سنائی کہ وہ اپنے ذہن کے فتور کو باہر نکال چکا ہے۔ اُس نے پہلے جیسا بننے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اور پھر سے ہر کام میں بھرپور حصہ لینے کا تہیہ کر لیا تو گل خان نے اس کی ساری سزائیں ختم کر دیں۔



آمنہ آنٹی کے ساتھ بیٹھی ٹی۔ وی پر ٹاک شو دیکھ رہی تھی جس کا موضوع بھی دہشت گردی تھا۔

دہشت گرد کون ہیں؟ کہاں سے آئیں ہیں؟ کیا واقعی یہ مسلمان ہیں؟

پروگرام میں مدعو تجزیہ نگاروں، دانش وروں اور مفکرین نے اپنی اپنی آراء کا اظہار کیا سب کی باتوں سے آمنہ نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ خود کش حملہ آور طالبان کے روپ میں غیر ملکی ہیں۔ طالبان کے جو بیانات سامنے آئے اس میں انہوں نے ان حملوں کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار

کر دیا۔ ان کا موقف تھا کہ ان کی لڑائی حکومت سے ہے عام عوام سے نہیں آمنہ تو پہلے ہی یہ سوچتی تھی کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی جان نہیں لے سکتا۔ مگر اس کا یہ بھی خیال تھا کہ ہوسکتا ہے ان کو غیر ملکی لیڈ کرر ہے ہوں لیکن یہ مقامی لوگ ہی ہیں۔ مقامی لوگوں کو استعمال کر کے وہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے کی مثال قائم کرنا چاہ رہے تھے۔

رفعت نے پوچھا۔

''بیٹی کیا واقعی یہ ہم لوگ نہیں......''

اس نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''آنٹی ممکن ہے یہ ہم نہ ہوں مگر یہ ہم میں سے ضرور ہیں۔ جب گھر کا فرد گھر کو نقصان پہنچانے کے بارے سوچ لے تو چور آسانی سے گھس آتے ہیں...... ہم لوگ ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ صوبائیت و تعصب، کینہ و بغض، نفرت و لالچ اور بے اعتباری وہ کمزوریاں ہیں جن سے ملک دشمن عناصر فائدہ اُٹھا رہے ہیں...... بھائی کو بھائی کے ہاتھوں مروا رہے ہیں......''۔

''بیٹی ہمیں ان کمزوریوں کو دور کرنا چاہیے......''

''انشاء اللہ یہ ضرور دور ہونگیں۔''

اُسے لگا جیسے جلد ہی سب اچھا ہو جائے گا۔ اس سے نہ صرف اس کے بھائی کی روح کو تسکین ملے گی بلکہ اس کے آنسو بھی تھم جائیں گے۔ بہت سی زندگیاں بھی بچ جائیں گئیں۔ گھر تباہ ہونے سے بچ جائیں گے۔ نوجوان دہشت گردی کا نشانہ نہیں بنیں گے۔ اپنی صلاحیتوں کو تخریبی کاموں میں صرف کرنے کی بجائے تعمیری کاموں پر خرچ کرینگے۔



آصف کو صائمہ اچھی لگنے لگی۔ وہ جب تک کالج میں رہتا۔ اس کی نظریں اُسی کے تعاقب میں لگی رہتیں۔ گھر پر اُس کے بارے سوچتا رہتا۔ پڑھائی وڑائی بھول کر عشق و محبت میں پڑ گیا۔ ماں کی باتیں یا تو سنتا ہی نہ اور اگر سنتا تو سمجھ ہی نہ آتیں کیونکہ دماغ میں وہی گھوم رہی ہوتی تھی۔ ماں اُسے دیکھ کے سر پکڑ کر بیٹھ جاتی۔ دوستوں میں بیٹھے ہوئے بھی اس کے خیالوں میں کھویا رہتا۔ کیفے ٹیریا میں جانا اب اس کی روٹین بن گئی۔ اور جب دوست اس تبدیلی کے بارے پوچھتے تو ٹال دیتا۔ پہلے پہل تو وہ یہ ہی سمجھتا رہا کہ وہ دوسری لڑکیوں سے منفرد ہے اس لیے وہ اس کو اہمیت دیتا ہے۔ مگر پھر اُس نے اپنے دل میں اُس کے لیے محبت کا احساس محسوس کیا اور رفتہ رفتہ اُسے مکمل یقین ہو گیا کہ وہ منفرد ہے لیکن وہ صرف اس وجہ سے اُسے اہمیت نہیں دے رہا تھا بلکہ اسے امپورٹنس دینے کی وجہ محبت کا جذبہ ہے۔ آخر اُس نے دوستوں کے سامنے اس محبت کا اظہار کر لیا۔

''یار میں اُسے چاہنے لگا ہوں......''

کالج گراؤنڈ میں بیٹھے اُس نے یہ خوشخبری سنائی تو اجمل اور کاشف کھڑے ہو کے ناچنے لگے۔

اجمل نے کہا۔

''یار ہم تو پہلے ہی کہتے تھے مگر تو نہ مانا......''

کاشف نے کہا۔

''ویسے یار صائمہ ہے بہت اچھی لڑکی......''

آصف نے مسکراتے ہوئے بولا۔

''اُدب سے اس کا نام لیا کرو۔ آخر کو وہ تمہارے دوست کی محبت ہے......مگر ایک مسئلہ ہے۔''

دونوں نے جھٹ سے اس سے مسئلے کے بارے پوچھا۔

''مجھے نہیں لگتا اُسے مجھ سے کسی قسم کا جذباتی لگاؤ پیدا ہو سکتا ہے......''

ایک ساعت کو تو وہ بھی فکر میں پڑ گئے مگر کاشف نے اپنا ذہن لڑاتے ہوئے اُسے جذباتی لگاؤ پیدا کرنے کے منصوبے بتائے۔ آصف نے باری باری ان پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ جہاں بھی اُسے صائمہ بیٹھی نظر آتی فوراً وہاں ٹپک پڑا۔ تنہا تو وہ اُسے کبھی نہ ملی تھی دوستوں کے ساتھ ہونے کی وجہ سے اُسے یہ فائدہ ہوا کہ وہ باتوں باتوں میں اپنی بات کہہ دیتا اور کسی کو شک بھی نہ ہوتا۔ سینئر ہونے کی وجہ سے اکثر صائمہ کو کچھ سمجھنا ہوتا تو وہ خود کو فوراً حاضر کر دیتا۔ اپنی اسائن منٹ فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ اسائن منٹ بنانے تک کی آفر کرتا۔ اور جواز یہ بیان کرتا کہ سینئر کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ جونیئرز کی مدد کرے۔ کینٹین میں بل پے کرنے سے لیکر اپنی ہر قسم کی خدمت پیش کرنے تک سارے حربے آزمائے۔ مگر ہمیشہ کاشف کا سہارا لیکر یہ فریضہ انجام دیا تا کہ اُسے شک نہ ہو۔ اور جب وہ سب جان جائے تو اُسے سچا عاشق سمجھے۔

صائمہ کالج کے لیے تیار ہو رہی تھی کہ بشریٰ نے اُسے اطلاع دی۔

''بیٹی تمہارے لیے پھول اور کارڈ آیا ہے......''

پھول اور کارڈ یہ سن کر وہ پریشان ہو گئی کہ آخر یہ کون ہے؟ جو یہ سب کر رہا ہے۔ کارڈ پر نام پڑھنا چاہا تو کوئی نام نہ درج تھا۔ آصف کے یہ سارے حربے بھی اسکی کھوئی ہوئی شخصیت میں تبدیلی نہ لا سکے۔ وہ جان گیا کہ وہ کسی کو اپنی زندگی میں داخل نہیں ہونے دے گی۔ وہ اپنی ذات کے بکھرے ذروں کو سمیٹنے کو تیار نہ تھی۔ اب اُس نے اسکے اور قریب ہونے کا ارادہ کیا۔ کیونکہ اسکا خیال تھا کسی کی موجودگی ہماری ذات میں تبدیلی ضرور لاتی ہے۔



گل خان کے آدمی کسی کام کے سلسلے میں جا رہے تھے کہ راستے میں ایک آدمی کو بے ہوش حالت میں پڑے دیکھا تو اُسے اُٹھا لائے۔

جب وہ ہوش میں آیا تو خود کو وہاں دیکھ کے حیران ہو گیا۔

''ہم......ہم یہاں کیسے؟''

گل خان نے جواب دیا۔

''ہمارا آدمی کو تم بے ہوش پڑے ملے تھے یہ تم کو اُٹھا لایا ہے......''

''ہم کئی دنوں سے بھوکا ہے......شاید اسی واسطے چکر آ گیا......''

گل خان نے جلدی سے اس کے کھانے پینے کے لیے منگوایا۔اور جب وہ پیٹ بھر کے کھا چکا اُس نے پوچھا۔

''تمہارا کیا نام ہے؟''

گل خان پہلے پہل تو اپنے آدمیوں کو ایک اجنبی کو اُٹھا کے لانے پر بہت غصے ہوا مگر جب اس کے پھٹے پرانے کپڑے، اُلجھے بال اور بھوک وافلاس سے مسخ چہرہ دیکھا تو اُس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔

''ہمارا نام اسفند ہے......''

سیف الرحمٰن نے پوچھا۔

''تم کہاں سے آیا ہے؟''

''دور کے گاؤں سے۔کئی روز سے گاؤں میں مزدوری تلاش کرنے کے بعد بھی کچھ کرنے کو نہ ملا تو گھر سے چل دیا۔چلتے چلتے یہاں نکل آیا کہ شاید کوئی مزدوری مل جائے......''

گل خان نے تفتیشی انداز میں کہا۔

''اس ویرانے میں تم کو مزدوری کیا خاک ملے گا؟''

''سوچوں میں اس قدر گم تھا کہ خبر ہی نہ ہوا کہ کہاں چلا جا رہا ہوں......''

پھر دونوں نے اسفند کے بارے سوچا اور آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ اُسے اپنے کیمپ میں شامل کر لیا جائے۔اسفند کو اب اُن کے بتائے ہوئے اصولوں پر کاربند رہنا تھا۔اور کسی بھی غلطی کی صورت میں بُرے نتائج کو بھگتنا تھا۔اسفند کو بہادر کی پلاٹون میں شامل کر دیا گیا۔اسفند کو دیکھتے ہی بہادر خوشی سے جھوم اُٹھا۔



آصف کینٹین میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ آخر صائمہ کے قریب ہونے کے لیے کیا کیا جائے۔وہ اپنی سوچوں میں گم تھا کہ صائمہ بھی اپنی فرینڈز کے ساتھ وہاں آ گئی۔صائمہ کے بارے سوچتے سوچتے اُس کے ذہن میں کوئی خیال آیا اور وہ کاشف سے کہنے لگا۔

''یار کل میں ایک رشتہ دار کے ہاں شادی میں گیا تو ایک انوکھا سا انکشاف ہوا......''

کاشف نے انکشاف کے بارے پوچھا تو اُس نے جواب دیا۔

''یہ کہ طالبان کی آڑ میں کچھ غیر ملکی یہ سب کاروائی کر رہے ہیں۔''

اجمل نے حیرت زدہ ہو کے پوچھا۔

''کیا؟''

''میں بھی اس قدر حیرت زدہ ہوا تھا...... اور اس بات پر بالکل بھی یقین نہ کرتا اگر چچا یہ بات نہ بتاتے...... اُنہیں نے یہ بات اس لیے وثوق سے کی ہے کہ اُن کے حلقہ احباب میں چند طالبان بھی ہیں۔''

کاشف نے کہا۔

''تمہارے چچا کو چاہیے کہ وہ فوراً پولیس سے رابطہ کریں...... اور اُنہیں پکڑوا دیں......''

''یار زیادہ جذباتی نہ ہو۔ پہلے میری بات سن لو پھر فیصلہ کرنا۔ یہ سچ ہے کہ طالبان پٹھان ہیں۔ چند ایک میرے چچا کے گاؤں کے قریب ہی ایک گاؤں میں رہتے ہیں۔ اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ ان کا موقف ہے خود کش حملے وہ نہیں کرواتے...... ان کی جنگ چند اصولوں پر ہے...... چند قوانین ان کے لیے قابل قبول نہیں۔''

اجمل نے پوچھا۔

''کونسے قانون؟ کن اُصولوں پر اختلاف ہے اُنہیں؟''

''مثلاً کو ایجوکیشن۔ میڈیا کے تو وہ سخت خلاف ہیں ان کا نظریہ ہے کہ یہ معاشرے میں برائی، بے حیائی اور فحاشی کا باعث ہے۔ وہ پاکستان کو اسلامی جمہوریہ پاکستان کی شکل میں دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔''

کاشف نے پوچھا۔

''خود کش حملہ آور طالبان نہیں......''

''ان کا تو یہی کہنا ہے۔ مگر یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ سب ملک دشمن لوگ ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اتنے کامیاب نہ ہوتے۔ یہ تو سچ ہے گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے......''

اجمل نے آصف کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''زر وہ آلہ ہے جس سے ہر اصول کاٹا جا سکتا ہے۔ ہمارے معاشرہ میں دولت کے عوض بکنے والوں کی کمی نہیں۔ یہ بکے ہوئے لوگ پھر بے بس، مجبور اور معصوم لوگوں کو خریدتے ہیں۔ ان کی مجبوریوں اور معصومیت سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ جہالت بھی ایک ایسا ہتھیار ہے جس سے یہ لوگ فائدہ اُٹھاتے ہیں...... یہ لوگ جو جہاد کے نام پر سینکڑوں انسانوں کی جان لے رہے ہیں...... ہوسکتا ہے اس کے صحیح مفہوم سے بھی بے خبر ہو...... بس جو اُنہیں بتایا جاتا ہے اُسے صحیح سمجھ لیتے ہیں......''

کاشف نے بھی اپنا تجربہ ان کے ساتھ شیئر کرنا چاہا۔

''صرف اَن پڑھ ہی نہیں بلکہ پڑھے لکھے؟ ویل ایجوکیٹیڈ بھی جاہل واقع ہوئے ہیں؟ ایک ڈاکٹر ہی کا قصہ سن لو۔ میں نے اُسے نماز پڑھتے دیکھا تو حیران رہ گیا اس کی پینٹ ٹخنوں سے نیچے تھی...... جوں ہی اس نے سلام پھیرا میں نے اُسے بتایا کہ مردوں کے ٹخنے ننگے ہونے چاہیے اُس نے تھینکس کہا اور بڑے معصومانہ انداز میں بولا...... مجھے علم نہیں تھا......''

آصف نے کہا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو......ہم پکی پکائی کھیر کھانے کے عادی ہیں۔خود سے پکانی پڑے تو کھاتے ہی نہیں...... جو کسی نے بتادیا سن لیا اور پھر سچ مان لیا......''

صائمہ بیٹھی تو دوستوں میں تھی مگر اس کا دماغ اس کے کان اُن کی باتوں کی طرف لگے ہوئے تھے۔وہ دل میں سوچ رہی تھی کہ واقعی ہم خود ہی اپنی تباہی و بربادی کے ذمہ دار ہیں......

آصف نے مشورہ دیا۔

''ہمیں کچھ کرنا چاہیے......''

آصف کی بات نے اُسے آمنہ کی یاد دلا دی وہ بھی آگاہی مشن لیکر نکلی تھی۔جب سب اُٹھ کے جانے لگیں تو اُسے بھی جھنجھوڑا اور وہ ہڑبڑا کے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔

''کیا ہوا؟''

اُنھوں نے اُسے یاد دلائی کہ کلاس کا ٹائم ہو گیا ہے جب اُس نے گھڑی پر نظر ڈالی تو واقعی وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں۔جلدی سے بیگ اُٹھایا اور ابھی جانے کو قدم بڑھایا ہی تھا کہ زوردار دھماکے کی آواز آئی۔سب وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔سب کو اپنی جانوں کے لالے پڑ گئے۔پوری کینٹین میں ایک بھگدڑ مچ گئی۔افراتفری کے عالم میں سب ایک دوسرے کو دھکے دے رہے تھے۔یوں لگا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔زمین زور زور سے ہلنے لگی ہو۔منظر گھومنے لگا ہو۔اپنی اپنی جان بچانے کے لیے بھاگتے ہوئے کسی کو دوسرے کی فکر ہی نہ تھی۔اگر اس بھگدڑ میں کوئی بیچارا گر گیا تو کسی نے اُسے اُٹھانے کی کوشش ہی نہ کی بلکہ اس کے اُوپر پاؤں دھرتے ہوئے آگے نکل گئے۔ہر کوئی چاہتا تھا کہ وہ جلد از جلد یہاں سے نکل کر خود کو کسی محفوظ جگہ پر لے جائے۔دوست دوست کو بھول گیا۔صائمہ اپنی ٹیبل کے قریب کھڑی گزرنے کی کوشش کر رہی تھی۔اُس کی سب سہیلیاں جا چکی تھیں۔کسی نے اس کا نہ سوچا بس جس جس کو موقعہ ملتا گیا وہ چلی گئی۔آصف بھی اپنی جگہ پر کھڑا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔جو صائمہ پر نظر پڑی تو اُسے یوں رش میں تنہا پایا تو قدم خود بخود اُس کی طرف بڑھ گئے۔اُسے اس رش سے باحفاظت نکالنے کو اس کے ساتھ ہولیا۔جس طرف رش زیادہ ہوتا وہ اس سمت کھڑا ہو جاتا۔یوں وہ اُسے لوگوں کی بھیڑ سے باہر نکال لایا۔کالج خالی ہو رہا تھا ہر کوئی یہاں سے بھاگنے کا جتن کر رہا تھا۔خوف و ہراس نے چاروں طرف اپنے ڈیرے ڈال لیے۔چیخ و پکار بلند ہونے لگیں۔

آمنہ کو جوں ہی کالج بم دھماکے کی خبر ملی فوراً صائمہ کے گھر پہنچ گی۔وہ گھبرائی ہوئی اور پریشان تھی۔بہت کوشش کے باوجود وہ اپنے چہرے کے تصورات کو چھپانے میں کامیاب نہ ہوئی۔گھر سے نکلتے ہوئے بھی جب رفعت نے اُس سے اس بے چینی اور گھبراہٹ کی وجہ پوچھی تو اس نے کچھ نہیں کہہ کے ٹال دیا۔اب بشریٰ بھی یوں اس کے اچانک آنے پر حیران تھی۔اس سے پریشانی کی وجہ پوچھ رہی تھی مگر اُس کا جواب اب بھی وہی تھا۔صائمہ کے بارے پوچھا تو بشریٰ نے کہا۔

''ابھی کالج سے نہیں لوٹی......''

اب تو اس کا دل اور زور زور سے دھڑکنے لگا۔ دل میں عجیب عجیب خیالات اُٹھنے لگے۔ مگر وہ ان خیالات کو دوسروں کے ساتھ شیئر کر کے اُنہیں پریشان بھی تو نہ کرنا چاہ رہی تھی۔ بس دل ہی دل میں خدا کے حضور دعا گو تھی کہ وہ اُسے بخیر و عافیت گھر پہنچا دے۔ وہ کسی اور پیارے کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ جب سے وہ یہاں آئی تھی ایک لمحے کو بھی ٹک کے نہ بیٹھی ادھر اُدھر ٹہلتی رہی۔ بشریٰ نے اُسے کئی بار کہا کہ بیٹھ جاؤ مگر وہ ہر بار یہ ہی کہہ دیتی۔

''آنٹی میں ٹھیک ہوں......آپ فکر نہ کریں......''

آمنہ کی بے چینی نے بشریٰ کو بھی بے چین کر دیا تھا مگر وہ اُسے کسی صورت بھی اپنی مشکل بتانے کو تیار نہ تھی۔ اور جب دروازے پر دستک ہوئی اور صائمہ کو بحفاظت، زندہ و سلامت اپنے سامنے پایا تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہوئے بشریٰ کو اپنی پریشانی کی وجہ بتائی۔

''میں بھی سوچ رہی تھی کہ آخر ایسی کیا بات ہوگئی ہے جس نے آمنہ بیٹی کو اس قدر پریشان کر دیا ہے......''

سب صائمہ کی خیریت دریافت کرتے رہے اور آصف کو بھول ہی گئے جو مسیحا بن کے اُس کی زندگی میں آیا تھا۔

یوں سب کو اپنے گرد دائرہ بنائے کھڑے دیکھ کر صائمہ کہنے لگی۔

''امی......یہ آصف ہیں......انہوں نے میری زندگی بچائی ہے......''

اب اُنہیں احساس ہوا کہ وہ اپنی خوشی میں اس شخص کو بالکل ہی بھول گئے جو اُن کے لیے خوشیاں لایا تھا۔ بشریٰ نے جلدی سے آصف کو بیٹھنے کو کرسی دی۔ اب وہ تینوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور بشریٰ اُن کے کھانے پینے کو لینے چلی آئی۔ آمنہ کے بارے جان کے آصف کو بہت افسوس ہوا۔ دونوں سہیلیوں کے چہروں کی اُداسیاں اور دُکھ نے اُس کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا۔

''ہم لوگ بھی کتنے ناداں ہیں......جانتے ہی نہیں کہ ہمارا چھوٹا سا عمل کتنے لوگوں کی زندگیوں کو ہمیشہ کے لیے تاریک کر سکتا ہے...... اپنے لیے جنت چاہنے والے اوروں کی دنیا کو جہنم کیوں بنا دیتے ہیں۔ معصوم اور بے گناہ انسانوں کی لاشوں پر جنت کا محل تعمیر کیسے ہو سکتا ہے؟''

آمنہ نے کہا۔

''یہ سوچ بیدار کرنا ہی اب میری زندگی کا مشن ہے......اس مشن کی تکمیل تک میں زندہ رہوں گی......چاہے اس کے لیے مجھے رب سے زندگی کے دن اُدھار ہی کیوں نہ لینے پڑے۔''



اسفند یہاں کی خوشیاں اور گہما گہمی دیکھ کے حیران تھا۔ آخر ان لوگوں کو کونسی ایسی بڑی فتح نصیب ہوگئی ہے جس نے اُنہیں اس قدر خوشی عطا کر دی ہے۔ جس کسی سے پوچھتا وہ یہ ہی کہتا ''آج فتح کا دن ہے'' فتح کس قسم کی فتح وہ یہ جان نہ پا رہا تھا۔ صبح سے وہ بہادر سے بھی نہ مل پایا تھا ورنہ یہ راز کب کا افشا ہو جاتا۔ اُسے اتنا تو اندازہ تھا ہی کہ کسی خودکش حملے کا جشن منایا جا رہا ہے۔ مگر آخر یہ کس قسم کا حملہ تھا نوعیت جاننا اس کے لیے اشد ضروری تھا۔ ابھی اُسے یہاں آئے ایک دن ہی گزرا تھا اس لیے وہ ان کے بارے کچھ نہ جان پایا تھا۔ گل خان کو دیکھتے ہی دل نے اُسے کہا ابھی تم

جان پاؤ گے۔گل خان نے سب کو اکٹھا کیا سب نے ایک زوردار نعرہ تکبیر لگایا۔الحمدللہ کا ورد کیا۔پھر گل خان نے لب کھولے۔

''الحمدللہ آج مشن بہت کامیاب ہوا...... کالج میں بہت سا لڑکی لوگ مارا گیا...... جب ہم نے کو ایجوکیشن ختم کرنے کا مطالبہ کر دیا تھا تو پھر اُن لوگوں نے ہمارا بات کیوں نہیں سنا۔ہم اس بے حیائی کو ختم کرے گا۔اس کے خلاف جنگ لڑے گا......تم ہمارا ساتھ دے گا''

سب نے یک زبان ہو کے کہا۔

''دے گا......دے گا......''

سیف الرحمٰن نے اب کہنا شروع کیا۔

''اب ہمارا ٹارگٹ ایسے سکول و کالجز ہے جو بے حیائی کا اڈاہ بنے ہوئے ہیں......تم اگلا حملہ تیار کرو......اللہ ہمیں فتح نصیب کرے گا''

اسفند تو ایک دم سر پکڑ کے رہ گیا۔وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ یہ لوگ اس قدر ظالم بھی ہو جائے گا کہ اپنے ہی ملک کا مستقبل تاریک کرنے لگیں گے، پڑھے لکھے نوجوانوں کو موت کی نیند سُلا کے جہالت کا ایک نیا باب رقم کرینگے۔سنگ دلی، بے رحمی، بزدلی اور ظلم کی تصویر کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔رحم اور احترام جس پر ہمارے مذہب نے بہت زور دیا ہے اُس کے بارے جانتے بھی نہ تھے۔ظلم و بربریت کو مذہب سے موسوم کر کے اُسے جہاد کا نام دے رہے تھے۔اُس نے اپنے دل میں اُٹھنے والے خیالات کو چہرے پر آنے سے روک لیا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے۔

رات کو بہادر اس کے ساتھ بیٹھا اُسے ان کی سنگدلی کے قصے سنا رہا تھا۔

''یہ لوگ بڑا ظالم ہے......انہوں نے پہلے بھی کالج جانے والا لڑکی لوگ کے چہروں کو تیزاب سے جلا دیا تھا۔یہ سب کو مار ڈالے گا۔یہ بہت ظالم ہے۔تم سب کو بچالو......''

اسفند نے اس سے وعدہ کیا۔

''ہمارا تم سے وعدہ ہے ہم ان ظالم لوگ سے بے گناہوں کو بچائے گا......ضرور بچائے گا......تم ہم کو بتاؤ کیا یہاں جو لوگ ہے وہ اپنا مرضی سے آیا......''

''نہیں......سب اپنی مرضی سے نہیں آیا۔کچھ لوگ مرضی سے آیا ہے۔کچھ مدرسے سے، کچھ کو اغواہ کیا ہے، کچھ تخریب کار ہے اور باقی کا یا تو زبردستی شامل کیا گیا ہے یا اُن کو پیسہ سے خریدا گیا ہے......سب کسی نہ کسی وجہ سے ان کا جال میں پھنسا ہے......لیکن اب سب خوش ہے......''

بہادر کی باتیں سننے کے بعد اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ جلد از جلد ان کے گروہ میں اہم ترین مقام بنائے گا تا کہ ان کے قریب تر جا کے ان کے ارادوں سے قبل از وقت آگاہ ہو سکے۔پھر اُس نے ایسا ہی کیا۔چند ہی دنوں میں وہ اپنی اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر پورے سنٹر میں مشہور ہو گیا۔اس کی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اُسے وہاں کا انسٹرکٹر مقرر کر دیا یوں وہ ٹرینی سے اساتذہ میں شامل ہو گیا۔اپنی قابلیت کی بنا پر اس نے اپنے شاگردوں کو بھی دوسروں سے بہتر بنا دیا۔اس کے ٹرینی دوسروں پر جسمانی لحاظ سے سبقت لے جانے لگے۔اب گل خان اور سیف الرحمٰن کے علاوہ قاری صاحب کی نظروں میں بھی وہ ایک اہم فرد بن گیا۔ان کا اعتماد بڑھنے لگا اور اکثر و بیشتر وہ رازدانہ باتیں جو دوسرے انسٹرکٹرز کے سامنے

کرنے سے ہچکچاتے اس کے سامنے کھل کے بیان کرتے۔

اسفند نے بھی خود کو ان کی نظروں میں قابل اعتبار شخص ثابت کیا۔

گل خان نے اسفند کو لڑکوں کے بارے بات چیت کے لیے بلوایا اور جب وہ اس کے کمرے کے قریب پہنچا تو اُسے ایک اجنبی سی آواز سنائی دی۔

''دو نیا لڑکا تیار کرو......منگل کو ان کا باری ہوگا......''

گل خان اور سیف الرحمٰن نے حکم کی تعمیل کرنے کا کہا۔ اسفند تو آج تک یہ ہی سمجھ رہا تھا کہ یہ دونوں ہی اس گروہ کے سردار ہیں۔ انہی کے دماغ چل رہے ہیں مگر پہلے قاری صاحب کا رونما ہونا اور اب اس اجنبی کی اچانک آمد نے اُس پر یہ ثابت کر دیا کہ یہ گروہ بہت بڑا ہے اور اس کی کڑیاں دور دور تک جاتی ہیں۔ ایک کڑی دوسری سے اور دوسری تیسری سے اور تیسری چوتھی سے اور یوں سلسلہ چلتا جاتا ہے وہ یہ ہی سوچ رہا تھا کہ اُسے کسی کے جاتے ہوئے قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ رات کے اندھیرے اور سناٹے میں وہ قدموں کی آہٹ بآسانی محسوس کر سکتا تھا۔ جوں ہی یہ آہٹ آہستہ آہستہ دور جاتی محسوس ہوئی اُسے خود کو الرٹ کیا۔ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا تا کہ اُنہیں شک نہ ہو سکے کہ وہ ان کی باتیں سن رہا ہے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ گل خان کی آواز آئی۔

''آجاؤ......''

وہ اندر داخل ہوا تو دونوں محوِ گفتگو تھے۔

سیف الرحمٰن نے پوچھا۔

''کیا بات ہے اسفند؟''

اسفند نے جواب دیا۔

''آپ نے بات کرنے کے واسطے بلایا تھا......''

دونوں نے اثبات میں سر ہلائے۔ پھر کہنے لگے۔

''ہم پلاٹون 11 کا دو لڑکا تمہارے حوالے کرنا چاہتا ہے......تم ان کو اچھی طرح تیار کر دو......''

اسفند نے حکم کی تعمیل کرنے کا کہا۔ تھوڑی دیر میں ایک شخص دو لڑکوں کو لیکر وہاں آ گیا۔ انہوں نے لڑکے اس کے حوالے کیے اور اُسے جانے کا کہہ دیا۔ اسفند نے ان کے چہروں پر نظر ڈالی تو ایک کے چہرے پر دُکھ، اُداسی، ملال اور غم کے اثرات جو اُس نے کبھی بہادر کے چہرے پر دیکھے تھے اُسے صاف دیکھائی دینے لگے۔ کسی قسم کے تربیتی عمل سے قبل وہ اس سے بات کرنے کا خواہاں تھا۔ اس لیے جب وہ وہاں سے باہر آیا اور اُنہیں واپس ان کے کمرے میں چھوڑا تو پہرے دار سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اس لڑکے کو ایک گلاس پانی دیکر ہمارا کمرہ میں بھیجو''

تھوڑی دیر بعد وہ پانی کا گلاس ہاتھ میں تھامے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ پانی کا گلاس اس کے ہاتھ سے پکڑتے ہوئے اسفند نے اُسے اپنے پاس بیٹھا لیا۔ اُس سے اس کے دل کی کیفیت کے بارے جاننا چاہا مگر اُس نے کچھ بھی بتانے سے انکار کر دیا۔ اسفند نے اس کا اعتماد بحال کرنے کو اُسے پیار کیا۔

''تمہیں معلوم ہے منگل کو تمہارا باری ہے......''

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''پھر تمہارا چہرہ پر دوسرا لڑکا کی طرح خوشی کیوں نہیں......تم جنت میں نہیں جانا چاہتا۔''

اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''نہیں......ہم یہ نہیں چاہتا......''

اس کے بعد اسفند نے بہت سے سوالات کیے مگر وہ خاموش بت بنا بیٹھا رہا اور اس کے کسی بھی سوال کا جواب نہ دیا وہ تو پہلے اپنے کہے ہوئے الفاظ پر ڈر رہا تھا۔ اس کے ڈر خوف، وہم وگمان کو ختم کرنے کے لیے اُس نے اپنے دل میں اُس کے لیے چھپی محبت و ہمدردی کے بارے بتایا تو وہ بے اختیار اس کے سامنے اپنے دل کی کیفیت بیان کرنے کو تیار ہو گیا۔ اپنے دُکھ کو بانٹنے لگا۔ اپنے غم کی روداد سنانے لگا۔

اُس نے اسفند کو بتایا کہ وہ پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے وہ اُسے زبردستی اس کے گھر سے اُٹھا لائے تھے۔ اُن دنوں وہ ہر گھر سے کسی ایک فرد کو اپنے گروہ میں شامل کر رہے تھے جب ان کے گھر کی باری آئی تو انہوں نے اس کا انتخاب کیا۔ کیونکہ اس کے گھر میں اس کے اور اس کے باپ کے علاوہ کوئی مرد نہ تھا۔ اس کے باپ کو بوڑھا ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا گیا اور اُسے گروہ میں شامل کر لیا گیا۔ انہوں نے دھمکی لگائی کہ اگر اُس نے یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی تو وہ اس کے خاندان کو ختم کر ڈالیں گے۔ انہوں نے اُسے لالچ دیا کہ خودکش حملے کے بعد وہ اس کے خاندان کو پندرہ لاکھ کی ایک خطیر رقم ادا کریں گے۔ وہ رونے لگا۔

''مگر ہم اس کے باوجود ایسا نہیں کرنا چاہتا......مگر یہاں سے بچ نکلنا ہمارا بس میں نہیں۔'' روتے ہوئے اس کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر روز روشن کی طرح عیاں تھا جب اُٹھائے جانے کے بعد اس کی ملاقات اچانک اپنی بہن سے ہوئی۔ وہ چند معلومات حاصل کرنے کی غرض سے گھر کے آس پاس گھوم رہا تھا۔ بہن نے بھائی کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا تو بھاگی بھاگی اس کی طرف آئی مگر اُس نے اُسے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا اس کی نگرانی ہو رہی ہے۔ جوں جوں وہ بھائی بھائی کہتے ہوئے اس کی طرف لپکتی وہ اُسے دھکے مار کے آگے بڑھتا جاتا۔

وہ روتی رہی فریاد کرتی رہی۔ ماں باپ کے بارے بتایا بہنوں کی حالت کا نقشہ بیان کیا مگر وہ انجان بنا رہا۔ اور اپنا کام کر کے روتی دھوتی بہن کو اس کی آہوں، سسکیوں اور فریادوں کے ساتھ چھوڑ کے چلا آیا۔ اسفند اس کی روداد سن کے کہنے لگا۔

''ہم تم کو بچائے گا......ہم......''

''یہ کیسے ممکن ہے؟......یہ نہیں ہو سکتا......''

''یہ تم ہم پر چھوڑ دو...... کیا تم کو حملہ کی جگہ کا علم ہے......''

''ہمارا خیال ہے ہم کو پولیس اسٹیشن پر حملہ کرنا ہے......''

''بس تم خاموش ہو جاؤ...... جاؤ بے فکر ہو کے سو جاؤ...... اور ہاں اس کا تذکرہ کسی سے مت کرنا''...... نہیں کروں گا......



آمنہ کے چہرے پر آج مسکراہٹ کے پھول کھلے ہوئے تھے نہ تو وہ لائبریری میں اُداس اور غمگین نظر آئی اور نہ گاڑی میں اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔ وہ خوش تھی۔ پہلی بار شاہد نے اُسے اس قدر خوش دیکھا تھا۔ اُس نے دل میں کہا موقعہ غنیمت ہے اس سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ اس خیال کے آتے ہی یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ آج کسی خوبصورت مقام پر جا کے دل کی بات کی جائے تا کہ قدرتی حسن اور اُس کے سچے جذبے دونوں مقناطیسی اثر چھوڑیں اور اس کی دلی خواہش پوری ہو جائے۔

''کہیں چلیں......''

آمنہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''کہاں......''

اس سوال نے اُسے بتا دیا کہ آج وہ اس کی کسی بات کا بُرا نہیں مانے گی۔ اس لیے کچھ اور پوچھنے کی زحمت ہی گوارا نہ کی اور اُسے ایک باغ میں لے آیا۔ وہ خوشی سے سرشار اردگرد سے بے خبر اُس کے ساتھ چل رہی تھی۔ اُسے خبر ہی نہ ہوئی کب وہ گاڑی سے اُتر کے اُس کے ساتھ چلتی ہوئی باغ میں آ گئی۔

''آج آپ بہت خوش نظر آ رہی ہیں......''

''ہاں...... آج میں بہت خوش ہوں......''

''اگر میں آپ سے کچھ کہوں تو آپ بُرا تو نہیں مانیں گی......''

اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... آج میں آپ تو کیا کسی کی بھی بات کا بُرا نہیں مانوں گی......''

''Really''

''ہاں......''

''آج آپ بہت حسین نظر آ رہی ہیں...... میرا مطلب ہے آپ مسکراتی ہوئی بہت اچھی لگتی ہیں۔''

''Sure''

''100% sure''

''اس کا مطلب تو یہ ہوا میں آپ کو روزا اچھی نہیں لگتی......''

''لگتی ہیں کیوں نہیں لگتی......مگر جب پھولوں پر بہار آتی ہے تو ان کا حسن اور نکھر جاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں اس پھول پر ہمیشہ بہار رہے۔ اس کی شادابی میں کبھی کمی واقع نہ ہو۔ اگر یہ پھول آپ مجھے گھر میں سجانے کی اجازت دے دیں۔ تو میں وعدہ کرتا ہوں اس پر ہمیشہ بہار کا موسم رہے گا۔ خزاں میں اس کے قریب نہ آنے دونگا......''

''آپ جانتے ہیں میں ایسا نہیں کر سکتی......''

''اگر آپ تھوڑی سی کوشش کریں تو یہ ہو سکتا ہے......''

''کوشش......''

''ہاں......ہمت اور کوشش سے تو ہم پہاڑ بھی توڑ سکتے ہیں تو پھر آپ کی ضد کیوں نہیں ٹوٹ سکتی۔''

''آپ کا خیال ہے میں ضد کی وجہ سے کوشش نہیں کرتی......اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے آپ غلط سوچ رہے ہیں......میں کسی شخص کے ساتھ زیادتی نہیں کرنا چاہتی......خاص طور پر اپنے محسن کو تکلیف دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی......''

''پلیز آپ مجھے محسن مت کہا کریں......میں آپ کی زندگی میں دوسرا مقام حاصل کرنا چاہتا ہوں......''

''ہم اس بحث کو کسی اور وقت کے لیے چھوڑ دیتے ہیں ''Time will decide, who is right

کچھ دیر وہ دونوں یوں ہی گھومتے پھرتے رہے اور پھر واپس آ گئے۔ شاہد خوش تھا۔ ماں نے بیٹے کو اس قدر خوش دیکھا تو اُسے یقین ہو گیا کہ وہ دن دور نہیں جب اس کے بیٹے کی دلی تمنا پوری ہوگی۔ اس کے آنگن میں خوشیوں کے پھول کھلیں گے۔



اسفند نے حملہ آور لڑکوں کی تربیت شروع کر دی۔ اُن کی پھرتی کو دیکھ کے گل خان اور سیف الرحمٰن کو یقین ہو گیا کہ حملہ کامیاب ہو گا ان کی دہشت بڑھے گی۔ وہ حملے کی کامیابی کے بارے بہت زیادہ پُر امید تھے۔ اور جب بھی اس کے بارے سوچتے نعرہ تکبیر بلند کرتے۔ جب حملہ آور حملے کے لیے مقررہ مقام پر پہنچے تو پولیس نے کامیابی سے اُنہیں پکڑ لیا۔ خود کش جیکٹ کو ناکارہ بنا دیا گیا۔ اپنے پکڑے جانے کے بعد اُسے اسفند کے وہ الفاظ یاد آ گئے۔ ہم تم کو بچالے گا......یہ سوچ کے اُس کا چہرہ کھل اُٹھا۔ اسفند نے حملے کے بارے پولیس کو پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا اس لیے مشتبہ افراد پر نظر رکھی جانے لگی۔ اور جب یہ دونوں حملہ آور خود کو خود کش حملے کی جیکٹ سے لیس کرنے کے لیے ایک مسجد میں داخل ہوئے تھے تو وہاں ڈیوٹی پر معمور پولیس اہلکاروں نے اُنہیں پکڑ لیا۔ اور یوں حملہ آور اپنے مقصد میں ناکام ہو گئے۔ اسفند نے اُسے یقین دلایا تھا کہ وہ اس کی معافی کے لیے حکومت سے درخواست کرے گا مگر وہ سزا پر بھی خوش تھا۔ اُس کے لیے اتنا اطمینان ہی کافی تھا کہ کئی بے گناہ افراد اس کے ظلم کا نشانہ بننے سے بچ گئے۔



کالج پر حملے کے بعد کئی روز تک کالج بند رہا۔ مگر پھر سے روٹین شروع ہو گئی۔ سب سٹوڈنٹ نے کلاسز اٹینڈ کرنا شروع کر دیں۔ اب

صائمہ کو آصف جہاں بھی نظر آتا وہ آگے بڑھ کے حال احوال پوچھتی۔ آخر کو وہ اس کا محسن تھا اور اس کا اتنا حق ضرور بنتا تھا۔ رفتہ رفتہ مراسم بڑھنے لگے۔ ایک دو بار وہ اُسے گھر تک بھی چھوڑنے آیا۔ اور پھر بہت زیادہ اصرار پر وہ صائمہ کے والدین سے ملنے کو آنے لگا۔ دونوں میاں بیوی اس کے آنے پر بہت خوش ہوتے اور کئی کئی گھنٹے وہ اُن سے باتیں کرتا رہتا۔ اُن کی باتوں سے اُسے بخوبی یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ بیٹی کے لیے بہت پریشان ہیں اس کا گھر بسانا چاہتے ہیں۔ اُسے اس کے گھر کا کر کے ہی اُنہیں سکھ کا سانس مل سکتا تھا۔ جہاں وہ والدین کی فکری مندی سے آگاہ تھا تو وہاں صائمہ کے دل کی کیفیت سے بھی بے خبر نہ تھا۔ حالانکہ جو اس کے والدین کی خوشی تھی وہ ہی اس کے دل کی بھی مراد تھی۔ مگر وہ اپنی دلی مراد کی خاطر اُسے اور دکھی ہوتا نہ دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے ساری صورت حال سے دوستوں کو آگاہ کیا تو انہوں نے اُسے سمجھایا کہ جو اس کے والدین کی خواہش ہے اور اس کے دل کی تمنا ہے اُسی میں صائمہ کی بھلائی اور خوشی پنہاں ہے۔ اگر وہ صائمہ کو اس کے حال پر چھوڑتا ہے تو یہ اس کے ساتھ ہمدردی نہیں بلکہ دشمنی ہے۔ عمر بھر یادوں کے سہارے چھوڑ دینے کا مطلب ہے اس کی تباہی۔ اس کو ان یادوں کے حصار سے نکالنا بہت ضروری ہے۔ زندگی کی طرف لانا لازم ہے۔ کیونکہ کانٹوں کو پھول سمجھ بھی لیا جائے تو بھی وہ کانٹے ہی رہتے ہیں۔ اگر وہ صائمہ سے محبت کرتا ہے تو اُسے اُس کو بتانا چاہیے کہ وہ جس ٹہنی پر بیٹھی ہے وہ کچی ہے کبھی بھی ٹوٹ سکتی ہے۔ جسے جگنو سمجھ کے وہ چل رہی ہے وہ ایک دیا ہے جس کی روشنی کسی بھی وقت تیز طوفان میں بجھ جائے گی اور پھر اس کے اردگرد صرف اندھیرے ہوں گے۔ ان کا خیال تھا کہ تنہا لڑکی کا اس معاشرے میں زندگی گزارنا مشکل ہے۔ کل کلاں کو اس کے والدین نہ رہے تو درندہ صفت انسان اُسے نوچ لیں گے۔ ان ساری باتوں نے اس پر بہت اثر کیا۔ لہٰذا اُس نے صائمہ کو اس کے حال پر چھوڑنے کا فیصلہ ترک کرتے ہوئے اس کے والدین کا ساتھ دینے کا سوچا۔ جب ارادے نیک ہوں تو خدا بھی بندے کا ساتھ دیتا ہے۔

جب وہ صائمہ کے گھر اس کے والدین سے ملنے کے واسطے گیا تو اُسے گھر پر اکیلا پا کے اُس سے دل کی بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب وہ دونوں بیٹھے چائے پی رہے تھے تو وہ کہنے لگا۔

’’میں مانتا ہوں کہ آپ کو اسد سے بے تحاشا محبت ہے۔ اور میں آپ کے اس جذبے کی قدر بھی کرتا ہوں...... مگر آپ کا یہ جذبہ دوسروں کے لیے اذیت کا باعث ہے...... میرا مطلب ہے آپ کے والدین اور دوسرے......‘‘

’’کون دوسرے؟‘‘

’’آپ اپنی دنیا میں اس قدر گم ہو چکی ہیں کہ آپ کو اردگرد بکھری محبت دکھائی ہی نہیں دے رہی میں آپ کا انتظار کرنے کو تیار ہوں...... اس وقت تک جب تک آپ خود اس دنیا سے باہر نکلنا نہ چاہے۔‘‘

’’میں کبھی بھی نکلنا نہیں چاہوں گی......‘‘

’’لیکن میں آپ کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دونگا...... آپ کو یہ خول اُتار پھینکنا ہوگا۔ اپنی خاطر، والدین کی خاطر اور میری خاطر......‘‘

آصف تو چلا گیا اور وہ یہ ساری باتیں یاد کر کے رونے لگی۔

’’اسد یہ سب تمہیں مجھ سے چھیننا چاہتے ہیں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں ایسا کروں...... مجھے یقین ہے تم ہرگز ایسا نہیں چاہو گے......‘‘

وہ خود سے محوِ گفتگو تھی کہ اُس کی آنکھوں کے سامنے اسد کا عکس آ گیا۔ اور وہ اُس سے کہنے لگا۔

''تم ان کی بات مان کیوں نہیں لیتی؟ میری خاطر ایک خیال اور یاد کی خاطر تم خود کو کیوں برباد کر رہی ہو؟ سب بھول جاؤ۔ آنکھ او جھل پہاڑ اُو جھل۔ میں مر چکا ہوں اب کبھی لوٹ کے نہیں آ سکتا۔ تم زندہ ہو ایک جیتی جاگتی انسان۔ تم رب کی عطا کردہ اس زندگی کو ضائع مت کرو۔ آصف کی بات مان لو وہ ایک اچھا انسان ہے تمہیں بہت خوش رکھے گا......''

''تم یہ سب نہیں کہہ سکتے......تم جانتے ہو میں تمہیں کتنا چاہتی ہوں......''

''چاہتی ہو تو میری بات مان لو......''

''اسد تمہیں یہ کیا ہو گیا ہے؟''

''صائمہ خواب اور حقیقت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ خواب اس وقت تک رہتا ہے جب تک ہماری آنکھیں بند رہیں۔ آنکھیں کھلتے ہی صرف حقیقت رہ جاتی ہے۔ میں ایک خواب ہوں اور آصف حقیقت۔ حقیقت سے رشتہ جوڑ لو خواب کو بھول جاؤ......''

اُس کا عکس غائب ہو جاتا ہے اور وہ اُسے بلاتی رہ جاتی ہے مگر وہ اس کی کوئی بات نہیں سنتا۔

اتنے میں بشریٰ بھی وہاں آ گئی۔ ماں کو دیکھ کے کہنے لگی۔

''ماں وہ مجھے بھول گیا ہے۔ وہ مجھے بھول گیا۔ چاہتا ہے میں بھی بھول جاؤں......''

''بیٹی تمہیں دُکھی دیکھ کے اُس کی روح کو تکلیف ہوتی ہوگی۔ اس لیے وہ تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہے......''



اسفند نے اب باقاعدہ ان کی حرکات و سکنات پر نظر رکھنا شروع کر دی۔ کئی بار اُسے قاری صاحب سے ملنے مدرسے بھی بھیجا گیا۔ وہاں جا کے وہ حیران و پریشان رہ گیا کیونکہ قاری صاحب اپنے علاقے میں ایک رحم دل، مخلص، ہمدرد اور نیک، پرہیز گار، غم خوار اور مددگار انسان کے طور پر مشہور تھے کسی کو کانوں کان خبر نہ تھی کہ مدرسے میں پڑھنے والے بچوں کا اصل کام کیا ہے۔ کسی کو اس بات کا علم بھی نہ تھا کہ ان کا تعلق کسی تنظیم یا گروہ سے ہے۔ اورنگ زیب کو بھی قاری صاحب نے اپنے بارے بتانے سے منع کر رکھا تھا۔ لوگوں کا عام خیال یہ ہی تھا کہ وہ صرف مذہبی تعلیم دیتے ہیں باقی جو تبلیغی گروہ ظلم و ستم ڈھا رہے ہیں وہ سب اورنگ زیب کے کہنے پر ہوتا ہے۔ اس قسم کے اور بہت سے رازوں کی فہرست اس کے پاس تھی۔ وہ حاصل کردہ تمام معلومات کو جلد از جلد اعلیٰ احکام تک پہنچانا چاہتا تھا۔ مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اُس کے لیے آسانی سے یہ کام کرنا ممکن نہیں۔ وہاں سے نکلنا آسان نہ تھا مگر اس ساری صورت حال کے باوجود اُس نے وہاں سے نکلنے کا منصوبہ تیار کر لیا۔ رات بھر وہ اُسی منصوبے کے بارے سوچتا رہا اور جب صبح اُٹھا تو اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کی حالت دیکھ کے گل خان نے اس کے بارے دریافت کرنا چاہا مگر قاری صاحب اور اورنگ زیب کی آمد متوقع تھی اس لیے اُس کے پاس ابھی فرصت نہ تھی۔ اس مسئلہ کو اُس نے اُن کے جانے کے بعد حل کرنے کا سوچا۔

اورنگ زیب آج پھر اپنے تیار کردہ چند آدمیوں کو ان کے حوالے کرنے کے واسطے آ رہا تھا۔

جب وہ وہاں پہنچے تو ان کا خوب استقبال کیا گیا۔قاری صاحب نے اورنگ زیب کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے گل خان سے کہا۔

''گل خان اورنگ زیب ہمارا خاص بندہ ہے......اس کا خاص خیال رکھا کرو......اگر کبھی یہ اکیلا بھی آئے تو اس کے استقبال میں کوئی کمی نہیں ہونا چاہیے......''

سیف الرحمٰن نے قاری صاحب کو تسلی دی۔

''آپ فکر ہی نہ کریں۔یہ آپ کا ہی نہیں ہمارا بھی دوست ہے......''

قاری صاحب نے سفارش کرتے ہوئے کہا۔

''گل خان تم اس کے واسطے اسلحہ اور رقم کا بندوبست کرو......''

گل خان نے مزید رقم اور اسلحے کی حامی بھر لی۔اور اورنگ زیب کی کارکردگی کے پیش نظر انعام کے بارے کمانڈر سے سفارش کرنے کی بھی یقین دہانی کرائی۔انعام کا سن کر اورنگ زیب کی باچھیں کھل اُٹھیں۔اسی لمحے گل خان نے قاری صاحب کے ہاتھ میں ایک خط پکڑا دیا۔

''یہ آپ کے واسطے کمانڈر نے دیا تھا......''

قاری صاحب نے خط کھولا تو اُس پر صرف اتنا لکھا تھا۔

''ہم سے ملو......''

اورنگ زیب نے بندے اُن کے حوالے کیے کچھ وقت گزارنے کے بعد اورنگ زیب اور قاری صاحب رخصت ہوگئے۔اُن کے رخصت ہوتے ہی گل خان کی نظر جو اسفند کی سرخ آنکھوں پر پڑی تو اُسے یاد آگیا۔اُسے پاس بلایا اور اس کی صحت کے بارے دریافت کرنے لگا۔مگر اس کی زبانی اس کی تندرستی کا سن کے دل کو تسلی ہوگئی۔کیونکہ اس کی بیماری ان کے لیے قابل قبول نہ تھی۔

''اگر تم بیمار نہیں تو ایسا کیوں دکھتا ہے؟''

گل خان کے سوال پر اسفند نے جواب دیا۔

''ہم نے رات کو اپنا ماں کو خواب میں دیکھا وہ سخت بیمار ہے......ہم سے ملنے کا خواہشمند ہے۔''

گل خان نے کچھ دیر اس بات پر غور وخوض کرنے کے بعد اُسے جانے کی اجازت تو دے دی۔مگر اس کے ساتھ اُسے احتیاط کی بھی تلقین کی۔کیونکہ پچھلے چند دنوں سے اُنہیں یہ خبریں مل رہی تھی کہ چند جاسوس اس علاقے میں گھس آئے ہیں۔اور ان تک پہنچنے کی کوشش کررہے ہیں۔اسفند نے اُسے یقین دلایا کہ وہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دے گا۔منصوبے کے مطابق وہ تمام معلومات کو ایک فائل کی شکل اکٹھا کرکے وہاں سے نکل پڑا۔وہ جانتا تھا کہ اس کی نگرانی کی جارہی ہوگی اس لیے وہ سارے راستے بہت محتاط رہا۔گاؤں میں پہنچ کے وہ ایک جھونپڑی میں گھس گیا۔اس میں ایک چارپائی پر ایک بوڑھی عورت کراہ رہی تھی۔وہ ماں کہہ کے اُس سے لپٹ گیا۔ماں نے بیٹے کو گلے لگالیا۔کافی دیر وہ ماں کے پاس بیٹھا رہا۔اور جاتے ہوئے فائل اس کے حوالے کرگیا۔اور احتیاط سے اُسے آگے پہنچانے کی تاکید کردی۔اس بوڑھی عورت نے بھی اُس کو مکمل رازداری اور احتیاط کی یقین

دہائی کروائی۔ وہ وہاں سے رخصت ہوا تو چند لوگ اس کی جھونپڑی میں داخل ہوگئے اور ارد گرد نظر دوڑائی تا کہ کوئی مشتبہ چیز نظر آئے تو وہ اسے لے جا سکے۔ مگر انہیں اس بوڑھیا کی چار پائی اور چند برتنوں کے سوا کچھ نہ ملا۔ اپنی تسلی کے بعد وہ یہ کہہ کے وہاں سے رخصت ہوگئے۔ ''ماں جی ہم آپ کا بیٹا کا دوست ہے...... آپ کا خیریت معلوم کرنے کے واسطے آیا تھا''

اسفند نے اُنہیں جھونپڑی میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اور جب اُسے ان کی واپسی کی تسلی ہوگئی تو دوبارہ اس جھونپڑی میں داخل ہوا۔ اب وہاں اس بوڑھیا کے علاوہ ایک سادہ لباس میں ملبوس آدمی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اسفند نے اُسے سیلوٹ کیا اور پھر فائل کی تسلی کر کے وہاں سے رخصت ہوگیا۔

اسفند کی کوششوں سے بہت سے حملہ آور پکڑے گئے۔ یہ کامیابی اُس کے اور بہادر کے لیے بہت بڑا انعام تھی۔ اب تو ان دونوں کی کوششیں اور بھی تیز ہوگئیں۔ ان کا مقصد جلد از جلد زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا تھا تا کہ جتنا ممکن ہو سکے ان حملوں کو روکا جائے تا کہ بے گناہوں کو بچایا جا سکے۔



صائمہ کئی روز تک آصف کے کہے ہوئے لفظوں پر غور کرتی رہی۔ وہ اس قدر پریشان تھی کہ کالج کو بھی بھول گئی۔ بس وہ ہوتی یا اس کا کمرہ۔ سارا سارا دن وہیں پڑی رہتی۔ ماں کے کہنے کے باوجود وہاں سے نہ نکلتی۔ جب وہ کئی روز تک کالج سے غیر حاضر رہی تو اس کی سہیلیاں اس کی خیریت معلوم کرنے اُس کے گھر پہنچ گئیں۔ اُنہوں نے ہی آصف کو اس کی حالت کے بارے بتایا۔ اس دن کے بعد سے وہ بھی صائمہ کے گھر نہ گیا تھا۔ وہ اُسے سوچنے کا موقعہ دینا چاہتا تھا۔ مگر جب علم ہوا کہ وہ کافی پریشان اور بیمار ہے تو اس سے رہا نہ گیا اور اس کے گھر آ گیا۔ اس کی آمد جہاں صائمہ کے لیے اُداسی کا باعث بنی تو وہاں اس کے والدین کے لیے باعث مسرت تھی۔ اُسے گھر پر دیکھ کے بشریٰ کہنے لگی۔

''بیٹا میں تو سمجھی تھی تم ہم لوگوں کو بھول ہی گئے ہو......''

''آنٹی ایسی تو کوئی بات نہیں......''

اتنے میں آمنہ بھی آ گئی۔ بشریٰ اُن کے لیے چائے بنانے چلی آئی اور وہ محو گفتگو ہو گئے۔ ملکی حالات پر بات کرتے ہوئے آمنہ نے آصف کو آگاہی مشن میں اپنا مددگار بننے کی آفر کر دی جس کو اس نے بخوشی قبول کر لیا۔ وہ تو کب سے اس بات کا خواہش مند تھا۔ اور اب جب اُسے موقعہ ملا تو وہ دل و جان سے اس کو avail کرنے پر رضامند ہوگیا۔ آمنہ اور آصف کا نظریہ تھا کہ جہاد کا جو امیج دہشت گرد پیش کر رہے ہیں جہاد اس کے برعکس ہے۔ وہ لوگوں میں اس کی اصل روح بیدار کرنے کے خواہش مند تھے۔ ان کا خیال تھا کہ دہشت گردوں کے نظریے کے پس منظر میں کچھ غیر ملکی عناصر ہیں۔ اور اس کا ذمہ دار وہ اس سوچ کو دے رہے تھے۔ جس نے ترقی کے جنون کو اس قدر بڑھا دیا ہے کہ وہ مذہب پر غالب آ گئی تھی۔ لوگوں نے مذہب کو چند افراد کی ذمہ داری سمجھ کے خود کو بر طرف کر دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مذہب کے بارے جاننا اس پر عمل کرنا صرف اس طبقے کی ذمہ داری ہے۔ آصف نے کہا۔

''بس ہمیں یہ طبقہ جو بتا دیتا ہے ہم درست مانتے ہیں...... خود جاننے کا نہ ہمارے پاس وقت رہا ہے اور نہ ہم میں خواہش باقی ہے......''

آمنہ اور آصف کی باتوں نے صائمہ کے دل میں بھی خواہش پیدا کی کہ وہ بھی اپنا فرض ادا کرے۔ اُن کا ساتھ دے۔ اس نے بھی ان کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ کڑی سے کڑی ملنے لگی۔ پہلے آمنہ پھر شاہد پھر آصف، صائمہ اور ان کے دوست سب مل کر آہستہ آہستہ زنجیر کی صورت اختیار کر رہے تھے اور امید تھی یہ زنجیر ایک دن ان ظالموں کو جکڑ لے گی۔ اور جب اس زنجیر میں جکڑ کے وہ دنیا کے سامنے آئینگے تو دنیا پر بھی یہ حقیقت کھل جائے گی کہ اصل میں دہشت گرد کون لوگ ہیں۔

آگاہی مشن کو شروع کرنے کا وقت آ گیا تھا اور اس کے لیے وہ کوئی ایسا طریقہ استعمال کرنا چاہتے تھے جو روایتی طریقوں سے اگر بالکل مختلف نہ ہو تو کم از کم اس میں کوئی انداز ایسا ضرور ہو جس سے لوگ متاثر ہوں۔ مختلف لوگوں کی آراء کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ بات وہی موثر ہوتی ہے جو اُسی زبان و انداز میں کی جائے جس میں لوگ سننا اور سمجھنا چاہیں۔

ایک روز حضرت مجدد الف ثانی ؒ کا مطالعہ کرتے ہوئے اُس نے جانا کہ انہوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے خلفاء اور امراء کا سہارا لیا تھا۔ آپ امراء کی اہمیت اور عوام پر ان کے اثرات سے آگاہ تھے۔ ان کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہوئے آمنہ کی نظر سے وہ خط بھی گزرا جو انہوں نے نواب خان جہاں کو لکھا تھا۔ آپ لکھتے ہیں۔

''یہی خدمت جو آپ کر رہے ہیں اگر اس کو شریعت کی بجا آوری کے ساتھ جمع کر لیں تو گویا انبیاء کا کام کرینگے۔ جس سے دین منور و معمور ہوگا۔ ہم فقیر اگر کئی سالوں تک اس عمل میں جان سے کوشش کرتے رہے تو بھی آپ جیسے بہادروں کی گرد تک نہیں پہنچ سکتے۔''

وہ یہ بھی جان پائی کہ آپ کے حلقہ اثر امراء کی بدولت اکبر کے مذہبی پالیسی کے حامی فرد کو جانشین مقررہ نہ کیا گیا۔ اور یوں اکبری مذہب پالیسوں سے اس دور کی عوام کو نجات ملی۔ آپ کا مقصد بھی غلط نظریات کا خاتمہ تھا۔

اس نے ان باتوں سے اندازہ لگایا کہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے اُنہیں بھی بااثر لوگوں کا سہارا لینا ہوگا۔ مگر اُسے بااثر لوگوں کی سمجھ نہ آ رہی تھی۔ عوام علماء اکرام سے خائف تھی۔ حکمرانوں پر اُنہیں یقین نہ رہا تھا۔ اب وہ کن لوگوں کا سہارا لے اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

صائمہ کینٹین میں بیٹھی آمنہ کے اس مسئلے کے بارے سوچ رہی تھی کہ اچانک اس کے کانوں میں اپنے قریب بیٹھی لڑکیوں کی گفتگو پڑی۔ ایک لڑکی نے لیز منگوانے کا کہا تو دوسری جھٹ سے بولی۔

''پاگل لیز کیوں منگوا رہی ہو......''

''کیوں؟...... کیا ہوا؟''

''لیز حرام ہیں......''

''تمہیں کس نے کہا''

''مجھے کس نے کہنا ہے۔ سب یہی کہتے ہیں......''

''تم بھی پاگل ہو۔ لیز کوئی حرام نہیں۔ مسئلہ صرف اتنا ہے کہ ہمارے ملک میں جو پروڈکٹ بھی مشہور ہو جائے اس کے خلاف

پروپیگنڈا شروع ہو جاتا ہے......"

"یہ ٹھیک کہتی ہے۔حرام کا صرف پروپیگنڈا تھا۔اگر یہ بات سچی ہوتی تو جنید جمشید جیسا شخص اسے حلال کیوں کہتا......"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔اگر یہ بات جنید جمشید نے کہی ہے تو پھر سو فیصد صحیح ہوگی......"

صائمہ کو ایک پوائنٹ مل گیا مگر وہ ابھی اس کے بارے مزید تحقیق کرنا چاہ رہی تھی اور اس کے بعد ہی کسی حتمی فیصلے پر پہنچ سکتی تھی۔اب اُس نے کالج میں طلباء کا مشاہدہ شروع کر دیا۔اُس نے دیکھا لڑکیاں اور لڑکے وہی کپڑے پہنے نظر آتے جو وہ ٹی۔وی آرٹسٹ کو پہنے ہوئے دیکھتے۔وہی پروڈکٹ خریدتے جوان کے پسندیدہ آرٹسٹ خریدتے دکھائے جاتے۔لڑکے شلوار قمیض پہن کے بڑے فخر سے کہتے۔

"یار یہ بھی فیشن ہے۔تم نے شہزادرائے کو نہیں دیکھا۔جنید جمشید بھی یہی پہنتا ہے"

ایک روز تو وہ ششدر رہ گئی لڑکیاں محوگفتگو تھیں۔

"یار اب تو میرا بھی جی چاہتا ہے کہ میں بھی مسلمان ہو جاؤں......"

"کیوں؟ پہلے تم مسلمان نہیں تھی......"

"میرے کہنے کا مطلب ہے۔صحیح والی مسلمان......"

''کیوں بھائی اس تبدیلی کی کیا وجہ ہے؟''

''تم نے علی زیب کو نہیں دیکھا......''

''ہاں۔ ہاں مشہور پاپ سنگر......''

''وہ بھی مسلمان ہو گیا ہے......''

''ارے پاگل وہ تو پہلے مسلمان تھا......''

''میرا مطلب ہے جنید جمشید کی طرح کا مسلمان۔ موسیقی وو سیقی چھوڑنے کا اعلان کر دیا ہے وہ توبہ تائب ہو گیا ہے۔''

''واقعی یار ایسے لوگوں کو دیکھ کے تو جی چاہتا ہے ہم بھی صحیح والے مسلمان ہو جائیں''

اب تو صائمہ کو سو فیصد یقین ہو گیا کہ آج کے دور میں سیلبر ٹیز ہی وہ واحد لوگ ہیں جو لوگوں میں مذہبی شعور بیدار کر سکتے ہیں۔ جو ملک میں پھیلے اس مذہبی پروپیگنڈا کو ختم کر سکتے ہیں۔ فرقہ واریت، صوبائیت کو ختم کر کے ملک کو مستحکم بنا سکتے ہیں۔ جہاد کے نام پر پھیلی دہشت گردی کو مٹا سکتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ملک دن بدن بدامنی کا شکار ہو رہا ہے۔ جب اس نے اس کا تذکرہ باقی سب سے کیا تو سب متفق ہو گئے۔



عبداللہ تنہا رہ کے تھک گیا۔ اس نے گاؤں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اُس کا اب اس گاؤں میں کوئی بھی تو نہ رہا تھا۔ بچوں کو مدرسے میں داخل کروا کے وہ اب ان کی شکل دیکھنے کو ترس گیا تھا۔ مدرسے والے اُسے بچوں سے ملنے کی اجازت نہ دیتے۔ کئی بار وہاں جا کے گڑگڑایا۔ فریاد کی، منت سماجت کی مگر اُسے ٹال دیا جاتا کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کے اُسے چلتا کیا جاتا۔ سب کچھ چھن جانے کے بعد اسے یہ گاؤں یہ جھونپڑی کاٹ کھانے کو دوڑ رہی تھی۔ بیوی بچے اس کی کل کائنات تھے اور اس کے یہ کائنات یہاں کے آسمان تلے اُجڑ گئی تھی۔ وہ نیم پاگل ہو چکا تھا اور اسی نیم پاگل پن کی حالت میں وہ پیادہ وہاں سے چل دیا۔ کئی دن چلتا رہا۔ جہاں رات ہو جاتی وہیں بسیرا کر لیتا۔ جو کھانے کو مل جاتا کھا لیتا اس کے اندر کی بے چینی اُسے رکنے نہ دیتی۔ بس اس کا جی چاہتا وہ چلتا جائے یوں ہی چلتا جائے یہاں تک کے اسے موت آ جائے اور وہ اس دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جائے۔ وہ اب اس جہاں میں نہ رہنا چاہتا تھا۔ یہاں رہ کر اُسے لگتا اُس کے زخم ہمیشہ ہرے رہیں گے کبھی مندمل نہ ہوں گے ان کا واحد علاج موت تھا۔ ایک مسلمان ہونے کی وجہ سے وہ خودکشی کر کے حرام موت مرنے کو تیار نہ تھا۔ مگر وہ زندگی کا خواہش مند بھی نہ تھا۔ یوں ہی چلتے چلتے وہ شہر پہنچ گیا۔ اُس کی کوئی منزل نہ تھی کوئی پڑاؤ نہ تھا اُسے تو چلنا تھا اور جانے کب تک چلنا تھا۔

اس کی زبان پر ہر وقت یہ ہی الفاظ رہتے۔

''اس ملک کو بچاؤ۔ ورنہ ہماری طرح پاگل ہو جاؤ گے۔ پاگل ہو جاؤ گے......''

جہاں کہیں اُسے کوئی بچہ دکھائی دیتا لپک کے اُسے پکڑ لیتا گلے لگاتا پیار کرتا اور کہتا۔

''جاؤ......اپنی امی کے پاس جاؤ......وہ تمہیں بھی لے جائیں گے......بھاگ جاؤ......بھاگ جاؤ......''

کئی دنوں سے وہ مسلسل چل رہا تھا۔اس کے پاؤں زخمی ہو چکے تھے۔کمزوری بڑھ گئی تھی اور اب اس کے اندر مزید چلنے کی سکت باقی نہ رہی تھی۔وہ جو قدم آگے بڑھاتا قدم اُٹھنے کا نام ہی نہ لیتے۔تھک ہار کے وہ اسی جگہ بیٹھ گیا یہ ایک ہوٹل تھا۔جہاں لوگ کھانا کھا رہے تھے۔کسی کو اس کی حالت دیکھ کے ترس آ گیا اور اس کے ہاتھ میں روٹی تھما دی۔وہ کئی دنوں سے بھوکا تھا لہٰذا روٹی کھانے لگا۔روٹی کھاتے کھاتے اس کی نظر ٹی وی پر پڑی۔ٹی وی سکرین پر اس وقت ایک لڑکے کو دکھایا جا رہا تھا اُسے دیکھ کے وہ چونک گیا۔روٹی وہیں رکھ دی۔اور ٹی وی کی طرف بھاگا۔

''ہمارا......ہمارا بچہ......''

چند آدمیوں نے اُسے یہ سوچ کے پکڑ لیا کہ پاگل ہے کہیں ٹی وی ہی نہ توڑ دے۔پھر اُسے کہنے لگے۔

''بابا یہ تمہارا بچہ نہیں ہے......''

وہ مسلسل یہ ہی کہہ رہا تھا ''ہمارا......ہمارا بچہ......''

''بابا یہ تو دہشت گرد ہے۔لوگوں کو مارنے آیا تھا مگر پکڑا گیا۔بابا ہوش کرو۔وہ ایک دہشت گرد اور تم درویش صف انسان......تمہارا اس کا کیا جوڑ۔تم اُسے اپنا کہہ رہے ہو اور وہ کہتا ہے میرے والدین بھی اگر میرے سامنے آئے تو میں اُنہیں بھی مارنے سے دریغ نہیں کروں گا......''

''نہیں ہمارا بیٹا ایسا نہیں ہے۔ہمارا بچہ ایسا نہیں ہے......''

''بابا وہ کہہ رہے ہے میں جہاد کر رہا ہوں۔اسلام کی خاطر لڑ رہا ہوں۔تم خود سوچو''

ان ساری باتوں پر عبداللہ کو یقین نہ آ رہا تھا۔وہ اُنہیں کہنے لگا۔

''ہمارا بیٹا ایسا نہیں ہو سکتا۔''

وہ سوچ رہا تھا یہ واقعی اس کا بیٹا نہیں تھا۔اُس نے تو کبھی کسی جانور کو بھی تکلیف نہ پہنچائی تھی پھر اس کا بیٹا سینکڑوں انسانوں کو مارنے کے بارے کیسے سوچ سکتا ہے۔انسانوں کے بارے سوچتے ہی اُسے یوں لگا جیسے کئی معصوموں کا خون اس کے گلے پر ہو۔اُس کے آٹھ بیٹے تھے مگر جانے اب کتنے رہ گئے تھے۔کتنے بیٹوں نے بے گناہوں کا خون کر دیا ہو۔وہ رونے لگا اور پھر اُسے یوں لگا جیسے بہت سی معصوم لاشیں اس کا تعاقب کر رہیں ہیں۔خوف کے عالم میں وہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔بے ہنگم ٹریفک کی پرواہ کیے بغیر وہ بھاگا چلا جا رہا تھا۔بھاگتے بھاگتے وہ آصف کی تیز رفتار گاڑی سے ٹکرایا اور سڑک پر گر گیا۔آصف نے جلدی سے گاڑی روکی۔اور عبداللہ کو ہسپتال لے آیا۔یہ ایک خطرناک قسم کا ایکسیڈنٹ تھا جس نے اس کا پنجر ہلا دیا۔عبداللہ کو فوراً ایمرجنسی میں لے جایا گیا۔مگر اس کی حالت خراب تھی۔ڈاکٹرز اپنی پوری کوشش کر رہے تھے۔آصف نے فون کر کے آمنہ،شاہد اور صائمہ کو بھی وہیں بلوا لیا۔آصف نے سوچ لیا تھا کہ وہ اس کی ہر طرح سے خدمت کرے گا اور اس کی خدمت یا علاج میں کسی قسم کی کسر نہ اُٹھا رکھے گا۔مگر اس کی حالت بہت خراب تھی۔عبداللہ نے مرنے سے پہلے اپنا بیان ریکارڈ کروانا چاہا۔

پولیس اُس کا بیان لکھنے پہنچ گی۔

''ہم اس بات کا......اعتراف کرتا ہے......اس ایکسیڈنٹ میں......اس بچے کا کوئی قصور نہیں۔ہم......تو اپنی قسمت......کا مارا ہوا ہے

۔۔۔۔۔۔ جو مر جائے۔۔۔۔۔۔ اُسے بھول جاؤ۔۔۔۔۔۔ جو زندہ ہے اُس کو بچانے۔۔۔۔۔۔ کا کوشش کرو۔۔۔۔۔۔ غریب شاید۔۔۔۔۔۔ آ تا ہی مرنے کے واسطے ہے۔۔۔۔۔۔ ہمارا بچہ لوگ کی طرح۔۔۔۔۔۔ دوسرا بچہ لوگ کو۔۔۔۔۔۔ غربت کا شکار۔۔۔۔۔۔ نہ ہونے دو۔۔۔۔۔۔ بچالو۔۔۔۔۔۔ بچالو۔۔۔۔۔۔ یہ لڑکا بے قصور ہے۔۔۔۔۔۔ ہمارا بچہ بھی بے گناہ تھا۔۔۔۔۔۔ غلطی ہمارا ہے۔۔۔۔۔۔ ہمارا حالات۔۔۔۔۔۔ کا ہے۔۔۔۔۔۔ بچالو۔۔۔۔۔۔"

بچالو بچالو کہتے ہوئے اس کی روح جسم سے پرواز کر گئی۔ عبداللہ تو اس جہاں سے چلا گیا مگر اپنی موت کا صدمہ ان کے دلوں میں چھوڑ گیا۔ آصف نے تہیہ کیا کہ وہ اس کے بارے میں جانے گا اور جب اُسے اس کے بارے میں علم ہوا کہ وہ کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ اس کے ساتھ کیا ہوا؟ کیوں وہ زندگی سے روٹھا ہوا تھا؟ تو اس کے دل میں آگاہی مشن نے اور خواہش پکڑ لی۔ وہ اس ملک اس ملک کے عوام کو بچانا چاہتا تھا۔ ان حالات کو درست کرنے کا خواہش مند تھا جو انسان کو اس قدر مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کو خود سے دور کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

غور و غوض کے بعد وہ سب اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ سیلبر ٹیز کو اپنے مشن میں اپنے ساتھ ملائیں۔ انہوں نے ایسے لوگوں کے نمبرز حاصل کیے جن پر عوام اعتبار کرتی ہے۔ جن کی بات سنتی ہے۔ اور جب ان سے رابطے کیے گے تو سب نے بخوشی ان کا ساتھ دینے کی حامی بھر لی۔ اُنہوں نے مختلف ٹی وی چینلز اور ریڈیو اسٹیشن سے بھی رابطے کیے۔ اور اُن سے مدد کی درخواست کی۔ سب کے سب ان کی بھر پور معاونت پر رضا مند تھے۔ پھر منصوبے کے مطابق یہ پروگرام ان اوقات میں نشر کرنا قرار پایا جن میں لوگوں کی زیادہ تعداد ٹی وی دیکھتی اور ریڈیو سنتی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اخبارات کا بھی سہارا لیا۔ مختلف سکولز کالجز اور یونیورسٹیز میں بھی جانے کا منصوبہ تھا۔ اور انہوں نے ایسے سکولوں اور کالجوں کا انتخاب کیا جو دور دراز علاقوں میں واقع تھیں۔ دیہی اور پہاڑی علاقے اُن کی priorities میں شامل تھے۔ یہ وہ علاقے تھے جہاں والدین کو مذہب کے نام پر بلیک میل کر کے اُنہیں اپنے بچوں کو جہادی تنظیموں میں شمولیت پر مجبور کیا جاتا تھا۔ یہ ہی وہ علاقے تھے جہاں غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کے خود کو فروخت کر دیا جاتا تھا۔

ان کے آگاہی پروگرام میں سب سے زیادہ توجہ جہاد کے بارے تعلیم دینے پر دی جاتی تھی۔ آصف نے مولانا صاحب کو بھی شمولیت کی دعوت دی جس کو انہوں نے بخوشی قبول کر لیا۔ کیونکہ ان کا مقصد بھی ملک میں امن و امان پھیلانا تھا۔ جب پہلے پروگرام کا آغاز ہوا تو یہ دن سب کے لیے بہت خوشی اور مسرت کا تھا۔ وہ اپنے مشن کو عملی طور پر شروع کرنے جا رہے تھے۔ پروگرام کے آغاز سے قبل لوگوں میں اس کی خوب مشہوری کی گئی۔ آصف، صائمہ چونکہ کالج سٹوڈنٹ تھے لہٰذا اُنہوں نے اور ان کے دوستوں نے کالج میں اس کی پبلسٹی کی چند پروگرامز لائیو نشر کیے جانے کا بھی منصوبہ بنایا گیا۔ شاہد، آمنہ، صائمہ، آصف اور ان کے دوستوں نے اپنے گھر والوں اور عزیز و اقارب کو خصوصاً اس پروگرام کو دیکھنے کی تاکید کی۔

رفعت ہاتھ میں ریموٹ پکڑے بیٹھی تھی کہ اُس کے سامنے ملک کی مشہور شخصیت علی زیب تھی۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم آج سے ہم آگاہی مشن کا آغاز کر رہے ہیں۔۔۔۔۔۔ یہ اس سلسلے کا پہلا پروگرام ہے۔ چونکہ ہمارے ملک میں دہشت گردی نے ڈیرے ڈال لیے ہیں۔۔۔۔۔۔ لہٰذا ہمارا مقصد لوگوں میں جہاد کی اصل روح بیدار کرنا ہے۔۔۔۔۔۔ تاکہ وہ معصوم لوگوں ان دہشت گردوں کے ہاتھوں جہاد کے نام پر بلیک میل ہونے سے بچ جائے۔ اس کے علاوہ ہمارا مقصد ہمارے مذہب اسلام کی اصل روح بیدار کرنا بھی ہے۔ تاکہ سب

جان سکیں کہ اسلام امن و آتشی کا مذہب ہے۔ ظلم و بربریت کا نہیں۔ بلکہ اسلام نے تو آ کر ظلم و بربریت کا خاتمہ کیا ہے۔ جہاد کی صورتیں جاننے سے قبل اس کے معنی اور مفہوم کو سمجھنا ضروری ہے۔

لفظ ''جہاد'' جہد سے مشتق یعنی (نکلا ہوا ہے)

گل خان اور سیف الرحمن اپنے کمرے میں بیٹھے ریڈیو سن رہے تھے۔ لفظ جہاد نے اُنہیں چونکایا۔ دونوں نے والیم ذرا اُونچا کیا اور الرٹ ہو کر بیٹھ گئے۔

''جس کے لغوی معنی ہے کوشش کرنا......سعی کرنا......شرعی اصطلاح میں ہر اس کوشش اور تگ و دو کو جہاد کہتے ہیں جو دین کی حمایت، اشاعت، تحفظ اور سربلندی کے لیے کی جائے''

آمنہ کو عامر نے ایک خفیہ نمبر دے رکھا تھا تا کہ ایمرجنسی کی صورت میں اُسے اطلاع دے سکے۔ پروگرام نشر ہو رہا تھا لہٰذا اُس نے عامر کو اطلاع دینا ضروری سمجھا اور نمبر ڈائل کیا۔ آمنہ کا نمبر دیکھ کے وہ پہلے تو پریشان ہو گیا کیونکہ رفعت بیمار رہنے لگی تھی پھر جلدی سے کال ریسو کی۔

''ہیلو......''

''اسلام وعلیکم بھائی......''

''وعلیکم سلام......سب خیریت ہے نا؟''

''جی بھائی۔ یہاں سب خیریت ہے......''

''پھر فون کس لیے کیا؟''

''آپ کو اطلاع دینا تھی۔ ہم نے اپنے مشن کا عملی طور پر آغاز کر دیا ہے......اگر ممکن ہو تو یہاں اس پروگرام کو باقاعدگی سے اپنے سٹوڈنٹ کو دکھائیں گا۔ انشاء اللہ بہت بڑی تبدیلی آئے گی۔'' وہ سر پکڑ کے بیٹھ گیا

''پگلی میں یہاں جان ہتھیلی پر لیے بیٹھا ہوں۔ ٹی وی نہیں جو یہ ممکن ہو سکے......''

''بھائی آپ بھی بالکل نکلے ہیں......''

''کیوں بھائی؟''

''ریڈیو تو ہے......''

''وہ بھی یہاں دستیاب نہیں۔ یہ لوگ پاگل ہیں جو یہاں ریڈیو سننے کی اجازت دیں اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کو کوئی اُلو ہی تیار ہو گا''

''آپ کا یہ موبائل کس روز کام آئے گا؟''

''کیا مطلب؟''

''اس پر ریڈیو سسٹم موجود ہے......''

''سمجھ گیا! بس اب بند کرو اگر خدانخواستہ کسی کو اس موبائل کی خبر ہوگی تو میری بھی چھٹی کرادینگے۔''

''ٹھیک ہے......بس آپ میری بات پر عمل ضرور کیجیے گا......سارے کام خود ہی ٹھیک ہوجائینگے......بگڑی بن جائے گی......''

''ٹھیک ہے......اللہ حافظ''

''اللہ حافظ......''

اسفند نے اِدھر اُدھر دیکھا وہ بالکل تنہا تھا اور دُور دور تک کوئی دکھائی بھی نہ دے رہا تھا۔ خدا کا شکر ادا کیا۔ اپنے حواس بحال کیے اور گل خان کے کمرے کی طرف چل دیا۔

اتنے میں شاہد وہاں آگیا۔ ''کیا کر رہی تھیں؟''

''فون......''

''کس کو''

''فکر نہ کریں بھائی کو......''

''نمبر ہے آپ کے پاس......''

''ایک نمبر تھا سوچا ٹرائے کرلوں شاید کام بن جائے اور اللہ نے معجزہ کردکھایا۔''

شاہد اس کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''اس سے ثابت ہوا کوشش کامیابی کی کنجی ہے......''

''ہاں......''

''مجھے بھی ٹرائے کرتے رہنا چاہیے میری بھی کال ریسو ہوجائے گی......''

My success is also hidden under my try.

Try, try again till you succeed.

''میں سمجھی نہیں......'' اس نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

''اب آپ اس قدر نا سمجھ بھی نہیں''

اتنے میں آصف، صائمہ، اجمل اور کاشف بھی آگئے۔ ان کی توجہ پروگرام کی جانب دلواتے ہوئے کہنے لگے۔

''بحث و مباحثہ بعد میں......پہلے کام کی بات سن لو......''

سب کے آجانے سے اس کی خلاصی ہوگئی۔ سب نے اپنی توجہ ٹی وی پر مرکوز کردی۔ اسفند جب گل خان کے کمرے کے قریب آیا تو اسے ریڈیو کی مدھم سی آواز آئی۔ دروازہ پہ نوک کیا۔ تو انہوں نے جلدی سے ریڈیو آف کرکے اُسے بستر میں چھپادیا۔ اندر آنے کی اجازت پا کے وہ اندر داخل ہوگیا۔

گل خان نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"ہم پوچھنے کے واسطے آیا تھا کہ اب کن لڑکوں کو تیار کرنا ہے......"

وہ اُسے جلد از جلد رخصت کرنا چاہ رہے تھے سیف الرحمٰن نے کہا۔ "تم جاؤ ہم تم کو بعد میں بتادے گا......"

وہ کمرے سے باہر آ گیا۔ دروازے کے قریب چند ساعتوں کو رُکا تو دوبارہ ریڈیو کی آواز آئی۔ اپنے شک کی تصدیق کرنے کے بعد وہاں سے رخصت ہو گیا۔ کمرے میں واپس آ کے اُس نے ریڈیو آن کیا اور خود بھی پروگرام سننے لگا۔ ساتھ ہی ریکارڈنگ کی غرض سے ریکارڈنگ بٹن بھی دبا دیا۔

"اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں خواہ ان کا تعلق جسم و جان سے ہو مال و دولت یا علم و حکمت سے ان سب کو اللہ تعالیٰ کے دین کی اشاعت سر بلندی کے لیے خرچ کرنے کا نام جہاد ہے...... اللہ تعالیٰ کے دین کی حمایت کی بہت سی صورتیں ہیں...... جن میں سے ایک اس کی راہ میں لڑنا...... عام اصطلاح میں...... اسلام کی حفاظت...... مسلمانوں پر زیادتی اور ظلم کو روکنے کی غرض سے جو جنگ کی جاتی ہے اُسے جہاد کہتے ہیں اس کا دوسرا نام قتال فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں لڑنا ہے)...... معاشرے میں پھیلی ہوئی مختلف خرابیوں کو روکنے کے لیے اپنی صلاحیتوں یعنی منصب، مقام، اختیار، قوت اور قوت استدلال کو استعمال میں لانا...... جہاد ہے......"

آج کا پروگرام اس آیت مبارکہ کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ اس کا حق ہے۔"

اگلے پروگرام میں ہم جہاد اور جنگ کے درمیان فرق کے بارے بات کریں گے۔ تب تک کے لیے اجازت دیجیے...... خدا ہمیں نیک عمل کی توفیق عطا فرمائے...... آمین...... خدا حافظ......"

اِدھر گل خان اور سیف الرحمٰن پروگرام سن رہے تھے تو اِدھر قاری صاحب اور، اورنگ زیب نے بھی حویلی پر اس پروگرام کو سنا۔ مگر اس پروگرام میں جب مسلمانوں پر ظلم و زیادتی کو روکنے کی بات ہو تو قاری صاحب نے والیوم خراب کر دیا۔ تاکہ وہاں موجود لوگ اس بات کو نہ سن سکے اور ان کے خلاف بغاوت پر نہ اُتر آئیں۔ مگر باقی کا پروگرام بڑے غور سے سنا۔

اسفند نے پروگرام ریکارڈ کر لیا اور پھر جوں ہی اُسے موقعہ میسر آیا اپنے ٹرینز کو سنوایا۔ اُس نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا کہ وہ خود سے کسی بھی قسم کے الفاظ نہیں ادا کرے گا۔ البتہ باقاعدگی سے ان پروگرامز کی ریکارڈنگ سناتا رہے گا تاکہ وہ خود فیصلہ کریں کہ کیا غلط ہے اور کیا درست......

اِدھر قاری صاحب اور ان کے حلقہ احباب نے اگلے پروگرام کو نہ سننے کا عہد کیا۔

منصوبے کے مطابق ٹی وی اور ریڈیو سے آن ائیر ہونے والا پروگرام اخبارات میں اشاعت کے لیے بھیج دیا گیا۔ طالب علم اپنے درمیان سیلبرٹی کو پا کے اور اس کی زبانی مذہب کے بارے جان کے بہت خوش ہوئے اور باقاعدگی سے ان دنوں سکولز اور کالجز اٹینڈ کرنے کا فیصلہ کی۔ بچے جو یہاں سنتے گھر جا کے اپنے والدین، دوستوں اور جاننے والوں کو بتاتے۔ سب میں دین کی خدمت کا جذبہ بیدار ہونے لگا۔ ملک کی حفاظت اور خدمت کی آرزو نے جنم لینا شروع کر دیا۔ اب سب کو اگلے پروگرام کا بے چینی سے انتظار تھا۔ سب جاننا چاہتے تھے کہ جنگ اور جہاد میں

کیا فرق ہے۔ اور اس کے بعد خود کش حملوں کو کیا گورائز کرنا چاہتے تھے۔ اور جب اگلا پروگرام آن آئیر ہوا تو ہر کوئی ٹی وی کے سامنے بیٹھا نظر آیا تو کوئی ریڈیو سنتا دکھائی دیا۔

اب کے پروگرام میں مہمان کے علاوہ ایک میزبان بھی موجود تھا۔ دونوں اہم اور مشہور شخصیات تھیں۔ ملک کا بچہ بچہ ان کے نام سے واقف تھا اور ان کی شوبز دنیا کے ساتھ دینی خدمت اور محبت سے بھی واقف تھے۔

میزبان نے سوال کیا۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ...... اپنے پچھلے پروگرام میں ہم نے جہاد کے معنی و مفہوم کو سمجھا ہم یہ جان پائے کہ دین کی اشاعت، حمایت، تحفظ اور سربلندی کے لیے کی جانے والی جنگ کو جہاد کہتے ہیں اب میں اپنے معزز مہمان سے کہوں گا کہ وہ ہمیں جنگ کے بارے بتائے......"

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ...... ہم دین کی اشاعت، حمایت، تحفظ اور سربلندی کے لیے لڑی جانے والی جنگ کو جہاد کہتے ہیں مگر اس کے برعکس جنگ ملک گیری کی ہوس ہوتی ہے جنگ میں پیش قدمی کر کے دوسری قوم پہ اچانک حملہ کر دیا جاتا ہے......"

شاہد نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"بالکل ...... جیسے 1972ء میں انڈیا نے اچانک ہم پر حملہ کر دیا تھا۔ انہوں نے ہم پر جنگ مسلط کی تھی۔ سب نے شاہد کی بات کی تائید کی۔ ایک بار پھر وہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہوئے۔"

"اسے جارحانہ جنگ بھی کہتے ہیں ...... ایسی جنگ میں نہ کچھ اصول ہوتے ہیں اور نہ آداب ...... ہر قسم کی اخلاق سوز حرکات اس میں روا ہوتی ہیں اس جنگ میں مفتوحہ علاقوں کو ویران اور برباد کر دیا جاتا ہے دوسرے انسانوں پر غلبہ حاصل کرنا اس کا اولین مقصد ہوتا ہے۔"

عفت خود سے کہنے لگی۔ "بالکل درست ...... ان دہشت گردوں اور حملہ آوروں کا مقصد بھی ہمارے ملک کو ویران اور برباد کرنا ہی تو ہے ...... یہاں کے عوام کو غلام بنانا اور پھر ان پر حکومت کرنا۔"

میزبان نے پوچھا۔ "اس کے برعکس جہاد کس کو کہیں گے......"

"یہ ہی میں بتا رہا ہوں ...... اس کے برعکس جہاد مسلمانوں کے دفاع اور بچاؤ کی کوشش ہے ...... اس لیے تو جہاد دفاعی جنگ ہے مگر اس دفاعی جنگ کی بھی شرائط ہیں ...... بہت سے پابندیاں ہیں ...... ہمارا مذہب زندگی کے ہر عمل میں ہمیں رہنمائی دیتا ہے ...... میں اپنا کوئی نظریہ نہیں پیش کروں گا بلکہ وہی بتاؤں گا جو ہم نے پڑھا ...... اور تحقیق سے نتیجہ اخذ کیا......"

میزبان نے پوچھا۔ "ہم سے آپ کی مراد......"

"میں اور میری پوری ٹیم ...... ہم نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ اسلام کی اصل روح کی اشاعت کریں اسلام جارحانہ اور اقدامی جنگ کی اجازت نہیں دیتا۔"

اس کے بعد میزبان نے اجازت چاہی اور پروگرام اپنے اختتام کو پہنچا۔ اب کی بار ریکارڈ پروگرام جو ٹرینز نے سناتوان کے اندر ایک ہل چل سی

بچ گی۔ صحیح اور غلط کا شعور بیدار ہونے لگا۔ اسفند نے ان کی بے چینی، ملال اور ہل چل کو پرکھتے ہوئے انہیں آئندہ کے پروگرامز سننے کا مشورہ دیا۔

انہی دنوں مزید حملوں کی خبریں نشر ہونے لگیں۔ حملوں میں بے گناہوں کی جانوں کے ضائع کی خبریں سن کے آمنہ کا جی کڑھتا اور اس کا دل چاہتا وہ راتوں رات ان دہشت گردوں کے دماغ درست کر ڈالے۔ مگر وہ جانتی تھی ایسا ممکن نہیں۔ اُسے Slow and steady win the race کے فارمولے پر عمل کرنا ہوگا۔ تبدیلیاں منٹوں میں نہیں لائی جاتیں اس کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ محنت کرنا پڑتی ہے۔ جانیں قربان کرنا ہوتی ہیں۔ ادھر آمنہ اور اس کی ٹیم تگ و دو کر رہی تھی تو اُدھر اسفند بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھا تھا۔ وہ جان ہتھیلی پر لیے ہوئے تھا ان کا ذرا سا شک اُسے موت کے منہ میں دھکیل سکتا تھا۔ مگر وہ سینکڑوں انسانوں کی خاطر اپنی جان کی قربانی کو تیار تھا۔ اور یہ اس کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ بہت سے حملے ناکام ہوئے۔

''آج ہم جہاد کی اقسام کے بارے بات کرینگے......''

''جہاد کی پانچ اقسام ہیں...... نفس کے خلاف جہاد، علمی وفکری جہاد، مالی جہاد، جہاد باللسان اور قتال......''

اس پروگرام میں مولانا صاحب کو بھی مدعو کیا گیا۔ لوگوں میں تھوڑا سا اعتماد بحال کرنے کے بعد انہوں نے ان کی شرکت لازمی سمجھی۔ مولانا صاحب نے کہا۔

جہاد بالنفس سے مراد اپنے جسم و جان کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری میں لگانا، اپنے نفس کو ناجائز خواہشات سے باز رکھنا یعنی ان کا مقابلہ کرنا ہے اپنے نفس سے جہاد کرنے کو آپ ﷺ نے جہاد اکبر کہا ہے...... اپنی خواہشات کا مقابلہ کرنا اور تزکیہ نفس کے لیے کوشش کرنا جنگ سے کہیں زیادہ مشکل ہے آپ ﷺ کا فرمان ہے۔

''بہترین جہاد وہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے نفس اور خواہشات سے جہاد کرو''

آپ ﷺ کا ہی ارشاد ہے۔

''مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے۔''

ایک مرتبہ آپ ﷺ ایک جنگ سے واپس تشریف لا رہے تھے کہ آپ ﷺ نے صحابہ اکرمؓ سے فرمایا۔

''تمہارا آنا مبارک! تم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف آئے ہو سب سے بڑا جہاد اپنی نفسانی خواہشات کو روکنا ہے......''

بشریٰ میاں سے کہنے لگی۔ ''کیا خوبصورت ارشادات ہیں...... ہمیں چھوٹے جہاد کی فکر لگی رہتی ہے بڑے جہاد کو تو ہم بھول ہی چکے ہیں......''

میاں بولا ''بیگم کاش! ہم سمجھتے...... عمل کرتے تو آج یہ نوبت نہ آتی ہمیں خود کو سنوارنے سے زیادہ اس بات کی فکر ستاتی ہے کہ دوسرے غلط کر رہے ہیں۔''

علمی وفکری جہاد کے بارے بات کرتے ہوئے علی زیب نے کہا۔ ''علم سے جہاد کرنا یہ ہے کہ...... انسان علم دین سیکھے اور سکھائے...... لوگوں کو نیکی کا راستہ دکھائے، اُسے تبلیغ یا جہاد بالقرآن بھی کہا جاتا ہے، بعض لوگ اسے ''جہاد بالدعوت'' کا نام بھی دیتے ہیں...... اپنی تقریر و تحریر اور

تبلیغ و دعوت سے دوسرے انسانوں کو فائدہ پہنچانا جہاد بالعلم ہے۔''

قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

''اور اس یعنی قرآن کے ذریعہ جہاد کیجیے جو بڑا جہاد ہے۔''

ہر سننے اور دیکھنے والا کہنے لگا۔ ''علم کے زیور کو تو ہم نے اُتار پھینکا ہے۔''

مولانا صاحب نے کہا۔ ''مالی جہاد میں مسلمان ترقی اسلام و اشاعت دین..... محتاج انسانوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے اگر جنگ کا موقعہ ہو تو مجاہدین کو اسلحہ فراہم کرنے کے لیے اللہ کی راہ میں اپنا مال قربان کرتا ہے...... عام حالات میں غریب و مفلس مسلمانوں کی مالی ضروریات کو پورا کرنے کا نام ہے۔''

قرآن پاک میں ارشاد ہے۔ ''اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو۔''

جب جہاد باللسان کی بات ہوئی تو سب کی توجہ اس پر مرکوز ہوگئی۔ اُنہیں یہ علم ہوا کہ لوگوں کو زبان سے تبلیغ کے ذریعے ہدایت کی راہ دکھائی جانی چاہیے۔ دعوت کا اصل اور صحیح طریقہ عمدہ انداز سے نصیحت کرنا ہے۔ اگر خدا نے کسی کو قوت استدلال، حسن خطابت اور دوسروں کو قائل کرنے کی صلاحیت عطا فرمائی ہو تو اگر وہ اُسے نیکی اور خیر کی طرف بلانے کے لیے صرف کرے تو یہ جہاد ہے۔

جب قتال یعنی اللہ کی راہ میں لڑنے کا ذکر ہوا تو مولانا صاحب نے کہا۔

''جب طاغوتی طاقتیں اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے پر تل جائیں تو مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ تن من دھن کی بازی لگا دے...... اسلام و اہل اسلام کی سالمیت و بقا کے لیے سب کچھ قربان کرنے سے دریغ نہ کریں......''

ان باتوں نے سب کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا کر دیا کہ آخر یہ سب کیا ہے جو وہ اس ملک میں کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہ جہاد تو کسی صورت بھی نہ تھا۔ مسلمانوں کی سالمیت و بقا کی بجائے وہ تو خود ان کی سالمیت و بقا کے لیے خطرہ بن گئے ہیں۔ ان کے ذہنوں میں سوال اُبھرنے لگے۔ کیا ہم مسلمان ہیں؟ کیا ہم جہاد کر رہے ہیں؟ کیا ہم درست ہیں؟ کیا ہم مسلمانوں کی حفاظت کر رہے ہیں؟ وہ اپنے اپنے چہروں اور حلیوں کو دیکھنے لگے ان کے چہروں پر بڑھی داڑھیاں، ان کا لباس سب مسلمانوں کی طرح تھی۔ دل میں کلمہ پڑھا۔ تسلی دی کہ وہ مسلمان ہیں مگر وہ یہ سب کیا کر رہے ہیں۔ ان کے دلوں و دماغ اُلجھ گئے۔ اسفند بھی انہی کی طرح سوچ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ آیت مبارکہ گونج اُٹھی۔

''اللہ کی راہ میں ان سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں''

اس آیت مبارکہ کی رو سے اپنے دفاع اور بچاؤ کے لیے اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑنا فرض ہے۔ اس سے اس کی ہمت اور بندھی۔ اس نے اپنے مشن کو اور تیزی سے شروع کرنے کا ارادہ بنا لیا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ ملک و قوم کو بچائے گا۔ ادھر قاری صاحب اور ان کے ساتھی بھی اس آگاہی مشن کے بارے جان گئے تھے۔ اُنہوں نے ایک دو جگہ لوگوں کو ریڈیو پر جہاد کی اقسام کے بارے سنتے دیکھا تھا۔ جب وہ ان کے قریب سے گزرے تو انہوں نے قاری صاحب کو بھی سننے کی دعوت دی مگر وہ کام کا بہانہ بنا کے وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ مگر سارے راستے اُنہیں یہ فکر لگی رہی

کہ اگر یہ مشن کامیاب ہو گیا تو ان کا مشن چوپٹ ہو جائے گا جو انہیں کسی صورت گوارا نہ تھا۔ ادھر قاری صاحب کو اپنے مشن کی ناکامی کی فکر کھائے جا رہی تھی تو اُدھر اورنگ زیب اور اس کے ساتھیوں کو پیسہ ہاتھوں سے جاتا نظر آنے لگا۔

قاری صاحب ساری رات سوچتے رہے پھر انہوں نے اورنگ زیب کو پیغام بھجوایا کہ وہ اور اس کے ساتھی ان سے مدرسہ پر آ کے ملیں۔ جوں ہی یہ پیغام اس تک پہنچا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو لے کے اُن کے مدرسے پہنچ گیا۔ قاری صاحب نے پہلے تو انہیں ساری صورت حال سے آگاہ کیا اور پھر کہا۔

''ریڈیو سننا گناہ ہے مگر تم اپنا علاقہ سے اس گناہ کو نہیں روک پا رہے اس کو روکو ورنہ تمہارا علاقہ کا لوگ تمہارا خلاف اُٹھ کھڑا ہو گا تمہارا جاگیر ختم ہو جائے گا...... ہمارا موت تمہارا موت ہے...... کیا تمہیں موت منظور ہے؟''

اورنگ زیب کو اپنی آنکھوں کے سامنے سارا پیسہ و رعب دبدبہ، جاگیر جاتی نظر آنے لگی خود کو زنجیروں میں جکڑا مفلسی کی حالت میں دیکھا تو ڈر گیا فوراً بولا۔ ''ہرگز نہیں ہم کو یہ ہرگز منظور نہیں ہم اس فتنہ ریڈیو کو ختم کرڈالے گا...... آپ فکر نہ کریں ہم اس فتنہ کا سر قلم کرے گا......''

اورنگ زیب نے اپنی تبلیغی جماعتوں کے ذریعے ہر جگہ اعلان کروا دیا کہ کوئی ریڈیو نہ سنے کیونکہ یہ غیر شرعی فعل ہے اور اگر کسی نے اس حکم کی تعمیل نہ کی تو اُس کو سنگین نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پہلے پہل تو اعلان کروایا گیا اس کے بعد تلاشی مہم شروع ہو گی۔ یہ جماعتیں ہر گلی کوچے میں جانے لگیں۔ گھروں کی تلاشی شروع ہو گی۔ اور جہاں کہیں انہیں یہ فتنہ پرور چیز نظر آتی فوراً توڑ دیتے اور آئندہ اسے لانے یا رکھنے کی سخت ممانعت کرتے۔ انہوں نے لوگوں کو لاعلم رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ اب باقاعدہ نگرانی ہونے لگی۔ لوگ تو پہلے ہی اورنگ زیب اور اس کے ساتھیوں سے ڈرے ہوئے تھے۔ اب تو ان کی دہشت اور بھی بڑھ گئی۔ چند ایک نے قاری صاحب کے پاس جانے کے بارے سوچا۔ مگر قاری صاحب نے بھی اُنہیں سمجھایا کہ یہ غیر شرعی فعل ہے ان کی تسلی ہو گئی اور وہ ریڈیو کے خلاف ہو گئے۔ مگر چند من چلے ایسے بھی تھے جن پر نہ تو قاری صاحب کی باتوں نے اثر چھوڑا اور نہ اورنگ زیب کے ساتھیوں کی دھمکیوں نے۔ انہوں نے بغاوت کی۔ چوری چھپے ریڈیو گھر میں رکھ لیے اور رات کے اندھیرے میں دھیمی آواز میں سننے لگے۔ اورنگ زیب نے رات کو بھی اپنے بندوں کے پہرے لگا دیے۔ ایک روز انہیں ایک گھر سے ریڈیو بجنے کی آواز آئی۔ گو آواز بہت دھیمی تھی مگر ان کے تیز کانوں نے سن لی۔ پہلے غلط فہمی سمجھ کے ٹال دیا مگر دو تین روز مسلسل نگرانی کے بعد اُنہیں یقین ہو گیا۔ رات کو تو وہ چلے گئے مگر دن کے اُجالے میں علاقے کے سبھی مرد حضرات کو اکٹھا کیا اور گھر کی تلاشی لی۔ ریڈیو نکلنے پر انہوں نے گھر کو گھر کے افراد سمیت آگ لگا دی۔ سب نے چیخ و پکار سنی۔ آگ کے شعلے دیکھے مگر کسی میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ وہ آگے بڑھ کے ان مظلوموں کی مدد کر سکے۔

''غیر شرعی فعل کرنے والوں کا یہ ہی حشر ہو گا......''

اس دھمکی نے ان کے دلوں میں خوف اور بڑھا دیا اب اگر کسی کے گھر ریڈیو موجود بھی تھا تو اس نے رات کے اندھیرے میں اُسے توڑ ڈالا اور اس کے ٹکڑوں کو زمین میں دفن کر دیا۔ کوئی بھی اپنی اور اپنے خاندان کی یوں موت نہ چاہتا تھا اس لیے ایسا کرنا اس کے حق میں بہتر تھا۔ قاری صاحب تک بھی یہ خبر پہنچ گئی۔ اُن کی باچھیں کھل اُٹھیں۔ چونکہ وہ کھلم کھلا اس ظلم میں شامل نہ ہوئے تھے اس لیے کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوئی کہ

اصل قاتل کون ہے۔ اورنگ زیب کی کارکردگی سے متاثر ہو کے قاری صاحب نے اُس کی مزید مالی معاونت کی۔ وہ مزے سے پورے علاقے پر حکومت کر رہا تھا۔ وہ اکیلا ہی اس عیش وعشرت کے مزے نہ لوٹ رہا تھا بلکہ اردگرد کے علاقوں کے بھی با اثر لوگ ان عنایات سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ علاقے پر حکومت الگ اور دولت کی ریل پیل الگ۔ ان سب کی انگلیاں اگر گھی میں تھیں تو سر کڑھائی میں۔ سبھوں نے لوگوں کی کھوپڑیوں کے محل تعمیر کیے تھے۔ ان کی لاشوں کی زمین پر بادشاہ بنے بیٹھے تھے۔

پورے علاقے کے لوگوں کے چہروں پر اُداسی، بے بسی، خوف اور ڈر نے اپنا ڈیرا ڈال لیا تھا۔ اگر انسانوں کے دل دُکھی تھے تو فضا بھی اس ظلم وستم پر ماتم کر رہی تھی۔ ہوا میں ایک التجا، فریاد اور منت تھی۔ وہ مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ لوگوں کے ہونٹ سل چکے تھے مگر اُس کی زبان بند کرنے کی نہ کسی میں طاقت تھی اور نہ اختیار۔ اسفند کو گل خان نے قاری صاحب کے پاس کسی کام سے بھیجا جب وہ اس علاقے میں داخل ہوا تو اُسے ہر چہرے پر ظلم وستم کی داستان نظر آئی۔ لب خاموش ضرور تھے مگر آنکھیں بول رہی تھیں مدد کو پکار رہی تھیں۔ فریاد کر رہی تھیں۔ یہاں کے در و دیوار خائف نظر آ رہے تھے۔ انسان روٹھے ہوئے تھے تو در و دیوار بھی خفا تھیں۔ سب کو شکوہ تھا کہ کوئی ان کی مدد کو نہیں آ رہا۔ جب اسفند نے اس علاقے میں قدم رکھا تو اُسے یوں لگا جیسے سب اُس سے شکوہ کر رہے ہو کہ تم اتنی دیر سے کیوں آئے ہو۔ اگر اب آ گئے ہو تو جلدی کرو ہمیں اس دلدل سے نکالو ورنہ ہم سب اس میں دھنس جائیں گے اور ہمارا خون تم اور تمہارے جیسے دوسرے آزاد انسانوں پر ہو گا۔ جو دور بیٹھے قیاس آرائیوں میں گم ہیں۔

ان التجاہوں، منتوں، فریادوں، شکوے شکایتوں سے اس کا دل بھر آیا مگر وہ اس قدر مجبور تھا کہ دو آنسو بھی نہ بہا سکتا تھا۔ وہ خود پر نادم تھا کیونکہ اس وقت وہ ایک ظالم کا پیغام دوسرے تک پہنچانے کی غرض سے آیا تھا۔ اُسے خود سے گھن آنے لگی۔ مگر اُس نے خود کو یہ کہہ کے تسلی دی کہ وہ یہ سب انہی لوگوں کی خاطر کر رہا ہے اور بہت جلد انہیں اس ظلم وستم کی چکی سے نکال لے گا۔ جب وہ مدرسے پہنچا تو خبر ہوئی قاری صاحب حویلی پر موجود ہیں وہاں سے حویلی آیا تو یہاں کی عیش وعشرت دیکھ کے دنگ رہ گیا۔ ان آسائشوں اور سہولتوں سے کوئی بھی اندازہ نہ لگا سکتا تھا کہ اس کے باہر کتنی غربت، مفلسی، ظلم و بربریت ہے۔ اورنگ زیب اور قاری صاحب کی خوش اخلاقی، نرم لہجہ اور مہمان نوازی کو دیکھ کے کوئی گماں بھی نہ کر پاتا کہ لوگ اس قدر درندہ صفت ہوں گے۔ اسے یہاں بیٹھنے سے گھٹن ہونے لگی۔ جلدی سے گل خان کا پیغام قاری صاحب کو پہنچایا اور وہاں سے یوں نکلا جیسے کوئی انسان دلدل سے نکلتا ہے۔ وہ خود کو وہاں جکڑا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اس پُر آسائش زندگی میں اُسے انسانوں کی لاشیں جا بجا دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کی آہ و پکار نے اُس کا وہاں ٹھہرنا دوبھر کر دیا۔ مگر وہ حیران تھا کہ وہاں کسی کو بھی نہ تو انسانوں کی لاشیں دکھائی دے رہی تھیں اور نہ ان کی آہ و پکار اور سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔

واپسی پہ اُسے پہاڑوں پر ایک برقعہ پوش خاتون نظر آئی۔ جب وہ اس کے قریب سے گزرا تو اُس نے اُسے روک لیا۔ وہ گھبرا گیا کیونکہ اگر کسی نے اُسے ایک عورت سے بات کرتے دیکھ لیا تو اس عورت بیچاری کی زندگی موت کے اندھیرے میں چلی جانا تھی۔ یہ سوچ کر وہ چل دیا وہ عورت اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ ہنستے روتے ہوئے جب اس نے اپنے خاندان پر ہونے والے ظلم کی روداد سنائی تو وہ رک گیا۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ اس ظلم کے بعد سے پاگل ہو چکی تھی۔ مگر اپنے خاندان پر ہونے والے ظلم کی داستان اُسے ابھی تک یاد تھی۔

وہ بیچاری بھی شاید اُسی آگ میں جل جاتی مگر قسمت نے اُسے بچالیا۔

''فرعونیت دیکھا ہے......نہیں دیکھا تو یہاں دیکھ لو......مگر اب تو وقت گزر گیا......سب جل گیا......اب تم کیسے دیکھ سکتے ہو......مگر ہم کو دیکھ لو ہم اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے......''

اس نے برقعے سے ہاتھ باہر نکالا تو اس کا ہاتھ جلا ہوا تھا۔ وہ ڈر گیا۔

وہ رونے لگی۔ ''بچالو......ہم کو بچالو......ورنہ سب مر جائے گا سب کا بچہ جل جائے گا......''

اتنا کہہ کر وہ واپس اُسی جگہ پر آ کے بیٹھ گئی جہاں اُس نے اُسے روکا تھا۔ اسفند سوچ رہا تھا کہ شاید اس کے دل نے اُسے اُس کا اصل روپ دکھا دیا ہے تبھی تو وہ اس کے قریب آئی، اور اس سے اتنا سب کہہ دیا ورنہ تو کسی میں بولنے کی ہمت نہ تھی۔ ایک آدمی نے اس عورت کو اسفند سے بات کرتے دیکھا۔ اسفند کی نظر بھی اس شخص پر پڑ گئی۔ مگر اس عورت کی زندگی کی خاطر وہ اس کے پاس گیا۔

''اس عورت کا کوئی قصور نہیں......''

اس کے جواب نے اسفند کو حیران کر ڈالا۔

''ہم جانتا ہے اس کا کوئی قصور نہیں یہ پاگل ہو چکا ہے گھر بار جل جانے کے بعد یہ پاگل ہو گیا......ہم سب حیران ہے کہ آگ نے اسے کیسے چھوڑ دیا......مگر حیرانی کا بات ہے یہ تو کسی سے بات نہیں کرتا۔ جب سے اس کے گھر اور خاندان کو جلا دیا گیا اور اسے علاقہ سے باہر نکال دیا گیا تب سے کسی سے بات نہیں کیا پھر تم سے کیسا کر لیا......تم کون ہے؟

اسفند نے سوال کر دیا۔ ''اس کو علاقہ سے کیوں نکال دیا گیا؟''

''اس واسطے کہ لوگ عبرت حاصل کر سکے......شریعت پر عمل نہ کرنے والوں کو علاقہ میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔''

''تم بھی سمجھتے ہو......''

''ہمارا سمجھنے یا نہ سمجھنے سے کیا ہوتا ہے......''

''تم لوگ مدد چاہتا ہے......اس ظلم و بربیت سے نکلنا چاہتا ہے۔''

وہ ایک پختون کی زبان سے اس قسم کی باتیں سن کر حیران تھا۔ ''تم کون ہے؟''

''اس بات کو چھوڑو۔ ہمیں بتاؤ تم اور یہاں کا عوام مدد چاہتا ہے......''

اُس نے ڈرتے ڈرتے کہا ''اندھا کو کیا چاہیے دو آنکھیں نا!''

اس نے یہ کہہ تو دیا مگر ڈرنے لگا کہ کہیں اس کا حشر بھی اس عورت اور اس کے گھر والوں جیسا نہ ہو۔ مگر اسفند نے اُسے پورا یقین دلایا کہ ایسا کچھ نہیں ہوگا بلکہ وہ ان کی مدد کرے گا ان کو اس ظلم کی چکی سے نکالے گا۔

اس نے اسفند سے کہا ''وعدہ......''

''پکا وعدہ......''

اسفند وعدہ کر کے وہاں سے چلا آیا۔ ایک ظلم کی داستان وہ سن کر آ رہا تھا اور دوسرے ظلم کے لیے پلاننگ یہاں ہو رہی تھی۔ اس کے دو ٹرینیز کل خودکش حملے کے لیے بھیجے جا رہے تھے۔ خودکش حملے کا نام سنتے ہی اس کی آنکھوں کے سامنے سینکڑوں بے گناہ انسانوں کی لاشیں آ گئیں۔ کئی گھروں کے چولہے بجھتے وہ دیکھ رہا تھا۔ ماؤں، بہنوں کی آہیں اور سسکیاں وہ سن رہا تھا۔

گل خان نے لڑکوں کو جنت کی نوید سنائی۔ اور جب اسفند کی نظر اُن پر پڑی تو اُسے بے بسی نظر آئی۔ وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلے آئے۔

اگلے روز گاڑی اُنہیں مقررہ مقام پر چھوڑ آئی۔ وہ اس مقام کو بغور دیکھ رہے تھے جیسے چند لمحوں بعد انہوں نے ماتم کدہ بنانا تھا۔ جہاں اُنہیں اپنی جانیں گنوانے کے ساتھ ساتھ دوسروں کی زندگیاں بھی اجاڑنا تھیں۔ کئی آنکھوں کو آبدیدہ کرنا تھا۔ اُنہیں یہ ظلم ہر حال کرنا تھا چاہے نتائج کتنے ہی بھیانک کیوں نہ ہو۔

دونوں حملے کا سامان لیے ایک مسجد کی طرف چل دیے۔ مسجد کے اندر داخل ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ دونوں نے جوتے وہیں اُتار دیے اور پھر ننگے پاؤں آگے بڑھنے لگے۔ اس مقدس جگہ پر چلتے ان کے ذہنوں میں سوال اُبھر آیا، کیا تمہیں معصوم انسانوں کے قتل کے واسطے یہ ہی مقدس جگہ نظر آئی تھی؟ تم اللہ کے گھر میں اس کی مخلوق کو مارنے کی تیاری کرنے آئے ہو۔ وہ خود کو یہاں محفوظ پا رہے تھے۔ اُنہیں لگا وہ جنت میں داخل ہو گئے ہو۔ دوزخ کہیں دور رہ گئی ہے۔ نگاہ اُٹھا کے دیکھا تو چار سوں امن و آشتی، پیار و محبت، پاکیزگی، تقدس، تحفظ اور سکون نظر آیا۔ اب وہ خود کو یہاں کا تقدس پامال کرتے محسوس کرنے لگے۔ فوراً پاؤں پر نظر ڈالی۔ جوتے اُترے ہوئے تھے۔ پھر اس احساس کے آنے پر حیران تھے۔ سامان ایک جانب رکھنے کے بعد وضو کرنے لگے۔ جب وضو کر چکے تو انگشت شہادت آسمان کی طرف اُٹھا کر کلمہ شہادت پڑھا۔ تو آواز آئی۔

''میری مخلوق کی تکلیف کا سامان کرنے جا رہے ہو تو کلمہ کیوں پڑھتے ہو؟''

دونوں نے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا۔ ''تم نے کچھ کہا''

دوسرا بولا۔ ''نہیں......تم نے کیا کچھ سنا''

''ہاں............''

''میں نے بھی......''

ان کے پاس کوئی نہ تھا۔

اب وہ خودکش حملے کی تیاری میں مصروف ہو گے۔ جسم تو ان کے وہاں تھے مگر دل و دماغ کہیں اور ہی تھے۔ یہ ایک ایسی دنیا تھی جہاں اُنہیں یہ سنائی دے رہا تھا۔

''بلاشبہ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں''۔

تمام مسلمان رشتہ اخوت میں پروئے ہوئے ہیں۔ یہ رشتہ جس میں اہل اسلام مربوط ہیں اتنا مضبوط ہے کہ کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ اگر کوئی توڑنا چاہیے تو اسلام سے ہی لاتعلق ہو جاتا ہے۔ تم جس نبی کے اُمتی ہو اُس نے تو خون کی پیاس بجھائی ہے۔

''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ وہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ مصیبتوں کے حوالے کرتا ہے اور نہ اسے حقیر جانتا ہے''

''باہمی شفقت اور مہربانی میں تم اہل ایمان کو ایک جسم کی طرح دیکھو گے۔ اگر اس کے جسم کا ایک عضو دکھنے لگے تو سارا جسم خواب اور بیدار میں اس کا ساتھ دیتا ہے۔''

مسلمان تو خود پر دوسرے مسلمان کو ترجیح دیتا ہے اس کی خاطر جان و مال قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔ وہ ایک دم گھبرا گئے اردگرد دیکھا کوئی بھی نہ تھا ایک بار پھر اُن کا سوال تھا۔

''تم نے کچھ سنا......؟''

اُنہیں یہ آوازیں پریشان کرنے لگیں۔ اُنہیں یوں لگا اگر وہ کچھ دیر اور رہے تو ان کی نسیں پھٹ جائیں گئیں۔ جلدی جلدی وہاں سے نکلنے کا سوچا۔ مسجد سے چلے آنے کے باوجود سوچوں اور خیالوں نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ قدم تو بڑھ رہے تھے مگر اُنہیں اب بھی وہی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

''ایک مرتبہ آپ ﷺ نے صحابہ اکرمؓ سے فرمایا! کیا میں تمہیں ایسا عمل نہ بتادوں جس کا درجہ نماز روزے اور زکوٰۃ سے بڑھ کے ہے۔ صحابہ اکرمؓ نے عرض کیا۔ یارسول اللہ ﷺ ضرور فرما دیجیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: دو مسلمانوں کے درمیان صلح کرا دینا ان سب سے افضل و بہتر ہے۔''

وہ خود سے کہنے لگے۔ ''مگر ہم تو دو مسلمانوں کو لڑوانے کا سامان کرنے جا رہے ہیں۔''

خود کو پھر تسلی دی۔ ''ہم تو جہاد کر رہے ہیں۔''

مگر پھر آواز آئی۔ ''ہر مسلمان پر لازم ہے کہ دوسرے مسلمان کی عزت و آبرو، مال و جان پر دست درازی نہ کرے۔''

آپ ﷺ کا فرمان ہے۔

''ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی آبرو مال اور خون (جان) حرام ہے۔''

مومن کو جان بوجھ کے قتل کرنے کی سزا قرآن حکیم نے دائمی جہنم بتائی ہے۔

''مسلمان کو گالی دینا فسق اور اسے قتل کرنا کفر ہے۔''

''جس نے کسی مسلمان کو ارادے سے قتل کیا وہ جہنم میں داخل ہوگا اور ہمیشہ اس میں رہے گا۔''

آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔

''مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔''

''اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔''

یہ آوازیں اُنہیں جھنجھوڑ رہیں تھیں۔ اُنہیں لگا اگر انہوں نے یہ ظلم کر دیا تو دائمی جہنم خرید لیں گے۔ قاری صاحب کی باتیں اُنہیں بے بنیاد لگنے لگیں۔ اور جب اس جگہ پہنچے تو ایک منٹ کو رُکے۔ ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر ہاتھ پکڑے وہاں سے چل دیے۔ اسفند بہت پریشان تھا۔ کئی خیال اس کے دل ودماغ میں گھومنے لگے۔ مگر خدا پر یقین نے اُسے سہارا دیا۔ ایک اُمید تھی کہ وہ نہیں کریں گے جیسا ان کو کرنے کو بھیجا گیا ہے۔



ریکارڈنگ نہ ہونے کی وجہ سے آمنہ نے دن آنٹی کے ساتھ گزارنے کا فیصلہ کیا۔ حالانکہ شاہد کی بے پناہ خواہش تھی کہ وہ یہ دن اُس کے ساتھ گزارے۔ مگر وہ نہ مانی۔ آمنہ اور رفعت ٹی وی کے سامنے بیٹھی چائے پی رہی تھیں کہ اچانک انہوں نے چائے کے کپ ایک جانب رکھے اور متوجہ ہو گئیں۔

''آج دو خودکش حملہ آوروں نے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔''

اتنا سننا تھا کہ وہ خوشی سے اُچھل پڑی۔ فوراً آنٹی کو گلے لگا لیا۔

''آنٹی آج ہمارے ملک کی قسمت بدل گئی ...... انقلاب آ گیا ...... ہم جیت گے ...... ہم نے کر دکھایا ......''

حملہ آوروں کا خود کو پولیس کے حوالے کرنا اس بات کا ثبوت تھا کہ ملک میں شعور بیدار ہونے لگا ہے لوگ جاننے لگے ہیں کہ معصوم انسانوں کا قتل جہاد نہیں گناہ ہے۔ اتنی بڑی خوشی سن کے اُس سے رہا نہ گیا اور صائمہ کو آگاہ کرنے کی غرض سے اس کا نمبر ملانے لگی۔ یہ کامیابی اُن سب کے لیے بہت بڑی فتح تھی۔ جوں ہی یہ خبر شاہد تک پہنچی اُس نے آمنہ کے اعزاز میں ٹریٹ دینے کا فیصلہ کیا۔ سب شاہد کی اس بات سے متفق تھے کہ اس کا سہرا آمنہ کے سر جاتا ہے۔ وہ روشنی کی پہلی کرن تھی اور اب سورج طلوع ہو رہا ہے۔ اس کے طلوع ہوتے ہی ساری طرف اُجالا ہی اُجالا ہوگا۔ آمنہ کسی ٹریٹ کے حق میں نہ تھی مگر سب کے سمجھانے پر وہ راضی ہو گئی اُن کا خیال تھا کہ اُنہیں ان خوشیوں کو منانا چاہیے اس طرح خوشیوں کا احساس ہوتا ہے۔ آمنہ کی خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے دعوت کا اہتمام شاہد کے گھر پر کیا گیا۔ اُس نے گھر کو دلہن کی طرح سجوایا۔ اور آمنہ کا اس قدر شاندار استقبال کیا کہ وہ فرطِ حیرت میں ڈوب گئی۔ مگر وہ شاہد کو گھر پر اکیلا پا کے کچھ پریشان بھی ہوئی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی سوال کرتی یا وہاں سے جانے کا فیصلہ سناتی وہ کہنے لگا۔

''پلیز آپ یہاں سے جانے کا مت سوچئے گا ...... میرا آپ سے یہ وعدہ ہے کہ آپ کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچے گا ......''

''مگر ......''

''اگر مگر کچھ نہیں ...... میں آپ سے تنہائی میں چند باتیں کرنا چاہتا ہوں ...... پلیز چند منٹ۔''

''مگر مجھے جانا ہے ......''

''میں آپ کو جانے نہیں دونگا ...... آپ کو میری بات سننا ہوگی ......''

وہ شاہد کی ڈھٹائی پر طیش میں آ گئی۔

''میں جا رہی ہوں......اگر آپ میں ہمت ہے تو مجھے روک کے دکھائیں۔''

اُس نے جانے کی غرض سے چند قدم آگے بڑھائے تو وہ سامنے کھڑا ہو گیا۔

''پلیز......چند منٹ......میں نے آپ سے وعدہ کیا ہے آپ کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچے گا......آپ نے مجھے اس قدر گھٹیا انسان سمجھا ہے جو کسی کی کمزوری اور بے بسی سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔''

وہ اس کی کسی بات پر یقین نہ کرنا چاہ رہی تھی اس سے پہلے کہ اس کے ساتھ کوئی اونچ نیچ ہوتی وہ یہاں سے فرار ہونا چاہتی تھی مگر شاہد بضد تھا کہ وہ چند منٹ اس کے ساتھ گزارے اس کی بات سنے جو اُسے کسی صورت قبول نہ تھا۔

''دیکھیں شاہد صاحب آپ میرا راستہ چھوڑ دیں ورنہ''

''ورنہ کیا؟''

''میں کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھوں جس سے نہ صرف آپ کو تکلیف ہو......بلکہ مجھے بھی پچھتانا پڑے کہ میں نے اپنے محسن کے ساتھ بُرا کیا''

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی اُس کے کانوں میں آواز پڑی۔

''ارے......ارے......کچھ مت کرنا۔اس بچارے کا کوئی قصور نہیں سب ہماری پلاننگ تھی۔''

یہ آصف کی آواز تھی اُس نے پیچھے مڑ کے دیکھا تو وہاں نہ صرف وہ بلکہ دوسرے دوست بھی موجود تھے۔

صائمہ نے آگے بڑھ کے کہا۔

''کیسا لگا مذاق''

''مذاق......''

''ہاں بھائی مذاق......ورنہ تم خود سوچو شاہد ایسا کرنے کا خیال بھی دل میں لانے کی ہمت کر سکتا۔ان کی باتوں نے آمنہ کو نہ صرف شرمندہ کر دیا بلکہ اُسے اپنے تلخ لہجے پر ملال ہونے لگا۔مگر اس سے قبل وہ کچھ کہتی شاہد وہاں سے چلا آیا۔اب سب نے اُسے مزید احساس دلایا کہ اُس نے شاہد کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے اُسے سوری بولنا چاہیے۔اُن سب کے کہنے پر ہی وہ اُس کے کمرے میں آئی۔شاہد کھڑکی کے پاس خاموش کھڑا تھا۔اپنی موجودگی کا احساس دلانے کو اس نے دروازے پر ناک کیا۔اُس نے دروازے کی طرف دیکھا تو وہ وہاں کھڑی تھی۔''

''آپ یہاں......''

''کیا میں نہیں آ سکتی؟''

''اس سوال کا جواب آپ بہتر انداز میں دے سکتی ہیں......''

''آپ ناراض ہو گئے......دراصل میں گھبرا گئی تھی۔پھر آپ نے بھی تو پہلی بار ایسا مذاق کیا ہے......میں توقع نہیں کر پا رہی تھی۔''

''میں بھی......''

''میں بہت شرمندہ ہوں ...... آئی ایم سوری ......''

''ارے آپ تو Serious ہی ہوگئی ......''

وہ مسکرانے لگا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ''میں تو ذرا ایکٹنگ کررہا تھا...... بھلا میں آپ سے ناراض ہوسکتا ہوں......''

وہ اس کے قریب آ کے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔'' آپ سے ناراضگی کا مطلب ہے خود سے ناراضگی ...... زندگی سے ناراضگی جو میں زندہ رہتے ہوئے afford نہیں کرسکتا۔''

وہ مسلسل اُس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا اُس نے جلدی سے اپنی نظریں جھکا لیں۔ اُس کی محبت نے اپنی شدت کا احساس دلا دیا وہ اس شدت سے گھبرا گئی۔ فوراً بات بدلنے کے لیے بولی۔

''چلیں۔''

''کہاں؟''

''ارے بھائی ...... سب ہمارا انتظار کررہے ہیں۔''

دونوں ڈرائنگ روم میں آ گئے جہاں سب بیٹھے اُن کا انتظار کررہے تھے۔ اُنہیں دیکھ کے آصف نے کہا۔

''اگر ایک یار اور شاہد ناراض ہوگیا اور آمنہ بیچاری کو منانا پڑا تو ہم غریب تو بھوک سے مرجائیں گے...... یار اب بار بار اس قسم کی ایکٹنگ مت کرنا...... اس سے تمہیں چاہیے فائدہ ہو مگر ہم سب کو نقصان ضرور ہوگا......''

سب مسکرانے لگے۔ شاہد نے سب کو کھانے کی میز پہ چلنے کو کہا۔ سب کھانا کھانے لگے۔ کھانے کے دوران آمنہ مسلسل آصف کو دیکھ رہی تھی جس کی نظریں سارا وقت صائمہ کے گرد گھومتی رہیں اُسے اس کی آنکھوں میں وہی محبت نظر آئی جو وہ شاہد کی آنکھوں میں اپنے لیے دیکھتی ہے۔ تبھی اُس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ صائمہ کو ہر قیمت پر رضامند کرے گی۔ شاہد نے سب کو ہنسانے کو اور خصوصاً آمنہ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کو کہا۔

''لیجیے معزز مہمان گرامی ایک لطیفہ عرض کرتا ہو......''

سب ہنس کے بولے''ارشاد ...... ارشاد......''

''تو جناب سنیے ہمارے ایک پٹھان بھائی کو شادی پر جانے کا موقعہ ہاتھ لگا...... فوراً اُس سے فائدہ اُٹھانے کا سوچا اور دعوت ولیمہ پر پہنچ گئے۔ جب کھانے کے ہال میں داخل ہوئے اور کھانا کھانے کے لیے پلیٹ ڈھونڈنے کو اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو کہیں بھی پلیٹ نہ پا کے بڑے مایوس ہوئے ...... اب وہ اپنے سامنے اس قدر مزیدار انواع واقسام کے کھانوں کو یوں پڑا ہوا تو نہ دیکھ سکتے تھے...... لہٰذا فوراً موقعہ سے فائدہ اُٹھانے کا خیال دل میں آیا...... اور قمیض کے دامن میں کھانا ڈال لیا...... اردگرد موجود لوگوں نے دیکھا تو پوچھا ...... خان صاحب یہ کیا کررہے ہیں؟ تو پتہ ہے خان صاحب نے کیا جواب دیا؟''

''کیا؟''

''داغ تو چلا جائے گا یہ وقت پھر نہیں آئے گا......''

سب خوب کھلکھلا کر ہنسے۔

آصف نے کہا۔''یار کہیں میرے لیے تو یہ لطیفہ نہ تھا......''

شاہد نے مسکراتے ہوئے کہا۔''اگر تم اتنے سمجھدار ہو تو مجھے کچھ کہنے کی بھلا کیا ضرورت ہے......''

اب تو صائمہ کے چہرے پر بھی خوب مسکراہٹ تھی۔ شاہد اور آصف دراصل اس قسم کی باتیں اُنہیں ہنسانے کو ہی کر رہے تھے۔ اور جب خود کو مقصد میں کامیاب ہوتے دیکھا تو پھر جو شروع ہوئے تو رکنے کا نام ہی نہ لیا۔ ہنس ہنس کے سب کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ آخر اُن بیچاروں کو خود ہی اُنہیں خاموش کرانا پڑا۔

کھانے کے بعد کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر صائمہ نے اجازت چاہی۔ وہ گھر جانا چاہ رہی تھی کیونکہ اس کے والد کی طبیعت آج بہت خراب تھی۔ اُس نے پہلے ہی آنے سے انکار کرنا چاہا تھا مگر آمنہ کی خاطر چلی آئی۔

جب وہ جانے کے لیے اُٹھی تو آمنہ نے بھی چلنا چاہا مگر اسی لمحے رفعت وہاں آ گئی اور اُسے روک لیا۔ اب مجبوراً اُسے رکنا پڑا۔ آصف کو بھی صائمہ کے ابو کی خیریت معلوم کرنا تھا اس لیے وہ اور صائمہ اجازت پا کے رخصت ہو گئے۔ ان کے جاتے ہی اجمل کاشف اور دوسرے لوگ بھی چلے آئے۔

آصف صائمہ سے اس کی رضامندی جاننا چاہتا تھا کئی دنوں سے موقعہ کی تلاش میں تھا مگر اُسے موقعہ میسر ہی نہ آیا آج اُسے موقعہ ملا تو اس نے فائدہ اُٹھانے کا سوچا۔

''اگر آپ کہے تو میں امی کو آپ کے گھر بھیج دوں......''

صائمہ نے انجان بنتے ہوئے کہا۔''مگر کیوں''

''آپ انجان بن رہی ہیں......آپ جانتی ہیں؟''

اب اس کے پاس کوئی جواز نہ رہا۔ اس لیے انجان بننے کی ایکٹنگ کرنا بے کار تھا لہٰذا بہتر یہ ہی سمجھا کہ صاف انکار کر دیا جائے۔ مگر اس کے انکار کے باوجود آصف نے کہا۔

''میں کچھ دنوں کے لیے یہ معاملہ ڈھیلے کیے دیتا ہوں......انکل صحت یاب ہو جائے تو پھر اس مسئلہ پر بات کرینگے۔''

اُس کے مسلسل انکار کے باوجود وہ اپنی بات پر بضد تھا۔ اس بحث میں وہ گھر پہنچ گئے۔ آصف بشیر صاحب کی خیریت دریافت کرنے کے بعد گھر لوٹ آیا۔ مگر صائمہ ساری رات اُس کے بارے سوچتی رہی۔ اگر وہ آصف کے بارے سوچتی تو فوراً اسد کی یاد آ جاتی اور وہ اس میں کھو جاتی۔ اُسے اسد کی باتیں بہت شدت سے ستانے لگیں۔ آصف کے بارے سوچتے سوچتے وہ اسد کی یاد میں کھو گئی۔

اسد اس وقت کمرے میں اکیلا تھا۔ اس نے دروازہ ناک کیا تا کہ وہ اس کی آمد سے باخبر ہو جائے مگر وہ انجان بنا کمپیوٹر میں کھویا رہا۔ اس

نے دوتین بار دروازہ ناک کیا۔ مگر وہ تھا کہ اس کی طرف دیکھنے کو تیار ہی نہ ہوا۔ اب اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔

"آنٹی...... ذرا اِدھر تو آیئے گا......"

آنٹی کا لفظ سننا تھا کہ اس نے فوراً توجہ کمپیوٹر سے ہٹا کے اس کی جانب مبذول کر دی۔

"ارے صائمہ آپ...... آئیں تشریف لائیں۔ امی کو بلوانے کی کیا ضرورت ہے؟ میں حاضر ہوں نا!"

"اب آیا اونٹ پہاڑ کے تلے۔ تم وہ گھی ہو جو سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلتا بندے بیچارے کو انگلی ٹیڑھی کرنا پڑتی ہے......"

اسد بولا۔ "اب زیادہ مت بنو...... سیدھی طرح بتاؤ کس کام سے آئی ہو؟"

"آنٹی......"

"اب کیا بات ہے؟ کیوں میری ماں بیچاری کو تکلیف دیتی ہو؟"

"تو پھر سیدھی طرح میری بات سنو......"

"سن تو رہا ہوں...... جلدی کرو مجھے بہت کام کرنا ہے......"

اس کے اُکھڑے لہجے میں نرمی لانے کو وہ بار بار اس کی ماں کو آوازیں دینے لگی۔ مگر اب وہ نہ تو گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا اور نہ ڈرا اور سہا۔ وہ پریشان ہوگئی اچانک اس قسم کی تبدیلی اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ کہاں وہ ایک بار آنٹی کہنے پر کمپیوٹر چھوڑ کے اُس کے پاس آن کھڑا ہوا تھا اور کہاں اب کئی آوازیں بھی اُس پر بے اثر تھیں۔

"حیران ہونے کی ضرورت نہیں مجھے یاد آ گیا امی گھر پر موجود نہیں اور نہ ہی آمنہ......"

"کیا؟"

"میں نے فارسی بولی جو تم سمجھ نہیں پا رہی......"

"سچ"

"مچ"

"اچھا تو میں چلتی ہوں......"

"ماشاءاللہ کہاں شیر بنی ہوئی تھی اور کہاں گیدڑ بن گئی......"

"مجھے ڈر لگ گیا ہے......"

"کس سے؟ یہاں تو میرے علاوہ کوئی نہیں......"

"تمہاری ہی تو بات کر رہی ہوں......"

"نہیں......"

وہ ذرا سا شرمائی......

''تو پھر میں تمہیں کیا لگتا ہوں؟'' اُس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''تم......تم......''

''اب بتا بھی چکو......''

''تم......تم......تم مجھے ڈرا یکولا بلکہ بھوت نظر آتے ہو......''



کئی دن گزر گئے مگر عامر کی کوئی خیر خبر نہ آئی۔ اس بات نے رفعت کو بہت پریشان کیا۔ دن رات وہ بیٹے کے بارے سوچتی رہتی۔ لان میں بیٹھی ہاتھ میں چائے کا کپ پکڑے وہ انہیں سوچوں میں گم تھی کہ اُسے خیال آیا آج جہاد کے مقاصد و آداب کے بارے پروگرام نشر ہونا ہے۔ اس غرض سے وہ ٹی وی لاؤنج میں آ گئی۔ پھر آمنہ نے بھی اُسے بہت تاکید کی تھی کہ وہ یہ پروگرام ضرور دیکھیں۔ ٹی وی آن کیا تو اس وقت بات ہو رہی تھی۔

''اسلام جو کہ امن و آتشی کا دین ہے۔ ہر صورت حال میں امن کا پیغام دیتا ہے۔ بے شک اسلام میں جہاد کی بہت اہمیت ہے مگر ہمارے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ......آخر وہ کونسے مقاصد ہیں جن کی خاطر جہاد کیا جاتا ہے...... جہاد کا اولین مقصد اسلام اور اہل اسلام کا دفاع ہے...... ہمارا مذہب ہمیں جنگ کی اجازت دین کی حفاظت اور اس کے ماننے والوں کے تحفظ کے لیے دیتا ہے۔......ارشاد باری تعالیٰ ہے۔''

''لڑو تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو تم سے لڑتے ہیں۔''

اس آیت مبارکہ میں صرف دفاع کے لیے لڑنے کی اجازت ہے......یعنی جو ہم سے لڑ رہے ہو یا لڑنے کا ارادہ رکھتے ہو......یعنی جنگ مسلط ہو جائے تو پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے۔

جب تک شرکی قوتوں کو دنیا سے ختم نہ کر دیا جائے امن کا قیام ممکن نہیں ہوتا...... جاہلیت کے دور میں عرب میں ہر طرف بدامنی کی فضا تھی......حرمت والے مہینوں میں بھی دھوکے کے طریقے اختیار کر کے دشمن پر حملہ کر دیا جاتا تھا......مگر مسلمانوں نے غزوات کے نتیجے میں عرب میں امن وامان قائم کیا۔

ان باتوں کو سننے والا ہر شخص ہی سوچ رہا تھا کہ جہاد کے نام پر لوگوں کو موت کی نیند سلانے والے در حقیقت شر پسند ہیں۔ کیونکہ وہ ملک کا امن وامان تباہ کر رہے ہیں۔ وہ اہل اسلام کا تحفظ نہیں بلکہ ان کے لیے خطرہ بنے ہوئے ہیں۔

''مظلوم اور بے کس مسلمانوں کو دشمن کے مظالم اور سختیوں سے نجات دلانا بھی جہاد کا اہم مقصد ہے......اگر ایک جگہ ظلم ہو رہا ہو تو اسے روکنا چاہیے...... بدامنی پھیلانے والوں کی سرکوبی ضروری ہے......تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ جب حضرت زید کے تجارتی قافلے کو بنو خزارہ نے لوٹا تو ان کو سزا دینے کے لیے چھوٹی سی فوج بھیجی گئی...... حضرت وحید کلبی جو آپ ﷺ کا خط لیکر قیصر کے پاس گئے واپس آ رہے تھے کہ چند لوگوں نے ان کا مال واسباب چھین لیا......ان کی سزا کے لیے حضرت زید کو بھیجا گیا۔''

اللہ کے نام کی سربلندی بھی با مقصد جہاد ہے...... اس کے ذریعے انسانوں کے بنائے ہوئے ظالمانہ اور استحصالی نظاموں سے دوسرے انسانوں کو نجات دلا کر...... انہیں اللہ کے بابرکت نظام کے تحت زندگی گزارنے کا موقع دیا جاتا ہے...... انسانی جان، عزت واحترام، مال بھی چیزیں اہمیت کی حامل ہوتی ہیں...... ہمارے پیارے نبی ﷺ کو قرآن کے ذریعے ان کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے...... اسلام میں جہاد کا مقصد مثبت اور تعمیری ہوتا ہے...... پاکیزہ وشرافت پر مبنی۔ آپ ﷺ کا مقصد جہاد میں حریف اور مقابل کو ہلاک کرنا...... نقصان پہنچانا نہ ہوتا تھا...... بلکہ شر کو ختم کرنا ہوتا...... جہاد کا مقصد مال ودولت، شہرت ناموری، اظہار شجاعت، قبائلی بالادستی وعصبیت کسی صورت نہیں ہونا چاہیے۔

قیامت کے دن تین بندے اللہ کے حضور پیش کیے جائیں گے...... ان کا فیصلہ قیامت کے دن سے پہلے کیا جائے گا۔ ان میں سے ایک وہ ہوگا جو لڑا اور اس نے جان قربان کی۔ اللہ تعالیٰ اس پر اپنی نعمتیں بتلائے گا...... اور اس سے پوچھے گا کہ تو نے میرے لیے کیا کیا وہ کہنے لگا میں نے تیری راہ میں جان قربان کر دی۔ اللہ تعالیٰ کہنے لگا۔ تو اس لیے لڑا کہ لوگ تجھے بہادر کہیں...... تو لوگ تجھے بہادر کہہ چکے ہیں لہٰذا اب میرے ہاں تیرے لیے کوئی بدلہ نہیں...... اس شخص کو جہنم میں پھینک دیا جائے گا...... جس شخص نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور ایک اونٹ باندھنے کے لیے رسی کی نیت کی تو اُسے وہی کچھ ملے گا جس کی اس نے نیت کی...... آپ ﷺ کا فرمان ہے اللہ تعالیٰ کوئی بھی عمل قبول نہیں کرتا...... جن کے وہ خالص اس کی خوشنودی کے لیے نہ کیا جائے...... اس صورت میں دینوی شہرت، مالی فوائد، کسی پر رعب، دبدبہ، تسلط جمانے کے لیے جنگ کرنے کا اسلام میں کوئی تصور نہیں...... اگر دوسری طرف فتنہ کا آغاز ہو تب بھی اس وقت تلوار اُٹھائی جائے گی جب تلوار سوا اصلاح احوال کے لیے ہو...... کوئی ذریعہ موجود نہ ہے۔

آپ ﷺ کا فرمان ہے۔

''کہ دشمن سے مقابلے کی تمنا نہ کرو امن وعافیت کی دُعا کرو امن وعافیت کی دُعا کرتے رہا کرو۔''

اسلام میں جنگ کا مقصد اسلام کی دعوت یا تبلیغ نہیں بلکہ دعوت دین پیش کرنے کی آزادی کا تحفظ ہے۔

جہاں جہاں یہ آواز سنائی دے رہی تھی سب لوگ ان باتوں کی تائید کرتے نظر آ رہے تھے۔ بچے، بوڑھے، جوان، مرد اور عورتیں سبھی اسلام کے سنہری اصولوں پر فخر کر رہے تھے۔ اور اس بات پر شاکر تھے کہ وہ ایسے مذہب کے پیروکار ہیں۔ جو امن کا پیغام دیتا ہے۔

جہاد کے مقاصد پر بات کرنے کے بعد جہاد کے آداب کے بارے میں بات کا یوں آغاز کیا۔

''اب ہم جہاد کے اسلامی آداب کے بارے جانتے ہیں۔ آپ ﷺ کا طریقہ تھا کہ جب فوج کسی مہم پر روانہ کی جاتی تو سپہ سالار کو حکم دیا جاتا۔''

''کہ کسی بوڑھے شخص کو، بچے کو، کمسن کو اور عورت کو قتل نہ کرو (ابوداؤد)''

اگر غزوات میں آپ ﷺ کسی عورت کی لاش دیکھتے...... تو آپ عورتوں کو قتل کرنے سے سختی سے منع فرماتے...... یہاں میں وہ اسلامی آداب بیان کروں گا جو جہاد یا جنگ کی حالت میں مدنظر رکھنے چاہیے...... یہ آداب ہی جنگ اور جہاد میں فرق واضح کرتے ہیں۔ مثلاً

کمزوروں کو قتل نہ کرنا...... غیر مصافی (نہ لڑنے والا) کو قتل نہ کرنا...... عبادت گاہوں کا احترام قتل کرنے کی ممانعت...... قتل کے بعد شکلیں نہ بگاڑنا...... لاشوں کو جلایا نہ جائے...... گھر بیٹھے رہنے والوں عورتوں، بچوں، معذوروں پر تلوار نہ اُٹھائی جائے...... کوئی پناہ مانگے تو پناہ دینا......

معاہدہ کی پابندی...... جوکلمہ پڑھ لے اسے قتل نہ کرنا...... جنگ سے قبل صلح کی کوشش کرنا...... رات کو حملہ نہ کرنا...... میں جہاد کرنے والوں سے اتنا پوچھنا چاہوں گا کیا انہوں نے عورتوں کا خیال کیا؟...... کیا بچوں کی پرواہ کی...... کیا عبادت گاہوں کا احترام؟...... کیا پناہ مانگنے والوں کو چھوڑا...... کیا کلمہ پڑھنے والوں کا سوچا...... آج بھائی بھائی کو قتل کررہا ہے...... ہمارا دین تو وہ دین ہے جو رنگ، نسل، ذات، شکل اور علاقے کو نظرانداز کرکے تمام مسلمانوں کو رشتہ اخوت میں پروتا ہے...... پھر ہم اتنے ظالم کیونکہ ہوگئے کہ اس رشتہ کو بھول گئے...... کیا ہم جہاد کررہے ہیں۔ کیا یہ وہی جہاد ہے جس کا ذکر قرآن وحدیث میں ملتا ہے...... اس کے ساتھ ہی میں آپ سے اس دُعا کے ساتھ اجازت چاہوں گا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اسلام کو سمجھنے اور اس کے اُصولوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے...... آمین...... اللہ نگہبان۔‘‘

اس پروگرام نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی جس کا اندازہ انہیں ملنے والے خطوط، ای میلز اور فون کالز سے ہوا۔ لوگوں نے آگاہی مشن کو جاری رکھنے کی درخواست کرنے کے ساتھ ساتھ اس مشن کو شروع کرنے پر بھی انتظامیہ کا بے پناہ شکریہ ادا کیا۔ اس پروگرام کی توسط سے لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ بے گناہ انسانوں کے قاتل مسلمان نہیں۔ یہ کوئی اور ہیں۔



ادھر قاری صاحب کو اپنی مقبولیت میں کمی واقع ہوتی دکھائی دی تو انہوں نے مدرسے پر باقاعدہ محفلیں منعقد کروانے کا فیصلہ کیا۔ جس کے ذریعے انہوں نے لوگوں میں یہ شعور بیدار کرنے کی کوشش کی کہ وہ برائی کے خلاف لڑرہے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ برائیاں متعدی خاصیت کی حامل ہوتی ہیں۔ جس طرح گندگی کے ڈھیر گردونواح میں وبائی امراض کے پھیلنے کا موجب بنتے ہیں اسی طرح برائیاں منکرات، بدکاریاں اور بداخلاقیاں پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لیکر اس کی بربادی کا سبب بنتی ہیں۔ جب برائیاں وبائی صورت اختیار کرتی ہیں تو نیک لوگ بھی اس کے اثرات سے محفوظ نہیں رہتے۔ اللہ ایسی قوموں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیتا ہے کسی قوم میں اگر تھوڑے بدکار لوگ ہوتو اللہ انہیں عذاب میں مبتلا نہیں کرے گا۔ جب لوگوں کی اکثریت گناہ کی زندگی اختیار کر لیتی ہے اور لوگ انہیں منع کرنے پر قادر ہونے کے باوجود انہیں منع نہیں کرتے اور خاموشی اور غفلت بڑھ جائے تو اللہ تعالیٰ خاص وعام سبھی کو عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ برائی کو دیکھ کے آنکھیں بند کر لینا اور اس کے لیے پہلوتہی کرنا ایک ناقابل معافی جرم ہے۔ اور وہ انہیں اس جرم سے بچانا چاہتا ہے۔

قاری صاحب کی تعلیمات کا لوگوں پہ بہت اثر ہوا اور اس اثر کو بڑھانے میں ان کی مالی معاونت نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ لوگ قاری صاحب کی باتوں کو اس لیے بھی سننے کو جاتے کہ ہر خطبے کے آخر میں ان کی کچھ مالی معاونت کی جاتی۔ غربت وافلاس میں جکڑے لوگوں کو اپنے دُکھوں سے نکلنے کے لیے اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے اس سے اچھی صورت دکھائی نہ دی۔

ٹریننگ سنٹر میں نوجوانوں کی تعداد میں اضافے نے اسفند کو فکر لاحق کر دی۔ اُس نے اس بات کا کھوج لگایا تو حقائق نے اُسے جہاں دُکھی کیا وہاں فکرمندی کو بھی بڑھا دیا۔ اسفند لحہ لحہ کی خبر اعلیٰ افسران تک پہنچا رہا تھا۔ وہاں ہونے والے ظلم وستم سے لوگوں کو نکالنے کے لیے کاروائی ضروری تھی۔ مگر بڑی سطح پر آپریشن سے قبل کچھ چھوٹے چھوٹے چھاپے مارے گئے۔ جس میں کامیابیاں نصیب ہوئیں۔ اسفند کی اطلاع پر ہی ایک جگہ چھاپہ مارا گیا۔ اس جگہ گل خان اور سیف الرحمٰن چند بچوں کو رکھے ہوئے تھے۔ ٹریننگ سنٹر میں بھجوانے سے قبل وہ ان کے بارے میں منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ ایک کمرے میں بچوں کو رکھا گیا تھا جہاں دو پہرے دار موجود تھے اور دوسرے کمرے میں ان دونوں کے درمیان خفیہ میٹنگ جاری تھی کہ گل خان کے موبائل پر رنگ ہوئی۔

"ہیلو......"

"ہیلو......قاری صاحب"

"تم گل خان بات کرتا ہے"

"جی......ہم گل خان ہے......"

"جلدی سے یہاں سے بچوں کو لے کے نکلو......"

"مگر کیوں؟"

"یہاں چھاپہ پڑنے والا ہے......"

"چھاپہ......"

"ہاں چھاپہ......بس جلدی کرو......اگر بچہ لوگ کو لانے میں دشواری ہو تو چھوڑ دو اور خود نکل آؤ...... "

"خدا حافظ......جلدی کرو......"

"خدا حافظ"

"کیا بات ہے گل خان؟"

"قاری صاحب کہہ رہے تھے چھاپہ پڑنے والا ہے جلدی سے نکلو ہم کو جلدی سے نکلنا ہوگا......"

سیف الرحمٰن گل خان کی زبان سے چھاپے کی خبر سن کے بہت حیران ہوا کیونکہ آج تک اُن کے کسی مقام پر چھاپہ نہیں پڑا تھا۔ البتہ دوسرے گروہوں کے چند ایک مقامات پر چھاپے کی خبریں اُنہیں ضرور ملی تھیں۔ اس وقت اُنہوں نے سوچا بھی نہ تھا کہ کبھی اُن پہ بھی ایسا وقت آجائے گا۔ گل خان اور سیف الرحمٰن جلدی سے کمرے سے نکلے وہاں موجود تمام بندوں کو اکٹھا کیا اور اُنہیں ہدایت دی۔

"چھاپہ پڑنے والا ہے......جو بچ نکلے پیچھے رہنے والا کا پرواہ نہ کرے......کیونکہ وہ بھی اتنا ہی کامیاب ہے جتنا بچنے والا......ہم ایک عظیم مقصد کے واسطے اپنا جان کا قربانی دے رہا ہے......"

ابھی اس کی بات ختم نہ ہوئی تھی کہ اس کے کانوں میں گاڑیوں کی آوازیں پڑیں۔ وہ ایک دم گھبرا گیا مگر پھر خود کو سنبھالتے ہوئے باقیوں کو وہیں کھڑا رہنے کا کہہ کے خود حالات کا جائزہ لینے کو دیوار کے قریب آیا۔ دیوار کے ساتھ لکڑی کا ایک سٹول رکھا ہوا تھا اس پر چڑھ کے اس نے ذرا سا سر اونچا کیا اور وہ یہ دیکھ کے حیران رہ گیا کہ اُنہیں چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا گیا ہے۔ اب وہ جلدی سے واپس پلٹا اور سب کو مختلف پوزیشن سونپ دیں۔ انہیں بار بار خود کو فوج کے حوالے کرنے کی وارننگ دی جارہی تھی۔ مگر وہ یہ وارننگ اس کان سے سن کے اُس کان سے نکال رہے تھے۔ کسی بھی قسم کی کاروائی اندر موجود بچوں کی زندگیوں کے لیے خطرہ تھی اور ان کی زندگیوں کو بچانے کے لیے محتاط حکمت عملی ضروری تھی۔

پہلے چند جوانوں کو اندر جانے کا حکم دیا گیا۔ بڑے محتاط انداز میں وہ دیوار پھلانگ کے اندر داخل ہو گئے۔ یہاں فائرنگ کے تبادلے کے بغیر ہی پہرے داروں کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔ اب آہستہ آہستہ جوان پیش قدمی کر رہے تھے۔ کچھ اور جوان بھی اندر داخل ہو گئے۔

گیٹ کھلتے ہی جوانوں نے اندر داخل ہونا شروع کر دیا۔ گل خان اور سیف الرحمٰن بچوں کے کمرے میں موجود تھے باقی کے شدت پسند مختلف جگہوں پر پہرہ دے رہے تھے۔ جوانوں نے پیش قدمی کرتے ہوئے بہت سے شدت پسندوں کو مار گرایا اور چند ایک زخمی بھی ہوئے وہ دونوں بار بار صورت حال کا جائزہ لے رہے تھے۔ فوج کی ہر فتح اُنہیں موت کا پیغام سنا رہی تھی۔ ان کا ہر بڑھتا قدم موت کو ان کے قریب کرتا جا رہا تھا۔ دونوں اس صورت حال سے نپٹنے کے لیے مختلف منصوبے بنا رہے تھے کبھی کمرے میں رہ کے لڑنے کا سوچتے کبھی باہر نکل کے تو کبھی بچوں کے سہارے وہاں سے نکلنے کا پلان بناتے۔ اس صورت حال میں سیف نے گل خان کو مشورہ دیا۔

"تم یہاں سے چلے جاؤ ہم ان کا مقابلہ کرے گا بچہ لوگ کو ہم اب کسی صورت اپنا ساتھ نہیں لے جا سکتا۔"

''مگر ہم تم کو چھوڑ کے نہیں جائے گا...... جیے گا تو دونوں ساتھ مرے گا تو دونوں ساتھ......''

''نہیں گل خان تم جاؤ......''

''یہ وقت بحث کا نہیں......''

''گل خان یہی ہم تمہیں سمجھا رہا ہے...... یہ وقت بحث کا نہیں تم نکل جاؤ ہم ان کو روکے گا۔''

فوج اب تیزی سے ان کی طرف پیش قدمی کر رہی تھی۔ سیف الرحمٰن نے بات کرتے ہوئے کھڑکی سے ذرا باہر جھانکا تو اُسے ایک جوان آگے بڑھتا نظر آیا جس کو اُس نے اپنی بندوق کی گولی سے زخمی کر دیا۔

''تم یہاں سے جاؤ...... وہ آگے بڑھ رہا ہے......''

اس نے ایک اور فوجی جوان کو زخمی کرتے ہوئے کہا۔ دونوں میں تکرار ہو رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو وہاں سے بھاگ جانے کا مشورہ دے رہے تھے۔ اتنے میں بہت سے جوان اُنہیں اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے نظر آنے لگے۔ وہ ابھی تک صرف اس وجہ سے بچ پائے تھے کہ وہ دوسری منزل پر موجود تھے اور آسانی سے نیچے سے آنے والوں کو زخمی اور شہید کر رہے تھے مگر اب انہیں اپنے گرد دائرہ تنگ ہوتا نظر آ رہا تھا۔ یہ ان کے لیے فیصلے کی آخری گھڑی تھی یا تو دونوں کو مرنا تھا یا کسی ایک کا بچاؤ کرنا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو بچانے کے لیے اپنی جان کی قربانی دینا چاہتے تھے۔ جوانوں کو تیزی سے پیش قدمی کرتے دیکھ کے سیف الرحمٰن بولا۔

''ہم تم کو اپنی یاری کا واسطہ دیتا ہے یہاں سے بھاگ جاؤ...... ہمارا سارا ساتھی مر چکا ہے...... تھوڑی دیر میں ہم دونوں بھی مر جائے گا...... ہم نہیں چاہتا کہ ہم دونوں مرے اس لیے تمہارا زندگی بچانے کا فیصلہ کرلیا ہے...... تم بھاگ جاؤ ہم ان کو روکے گا۔''

''مگر تم......''

''تم ہمارا فکر نہ کرو...... ہم نیک کام کے واسطے مرے گا اور تم اس نیک کام کے فروغ کے واسطے زندہ رہے گا......''

''جاؤ جلدی کرو......''

گل خان نے ارد گرد دیکھا۔ واقعی وہ ہر طرف سے گھر چکے تھے اور یہ گھیراؤ لحہ بہ لحہ تنگ ہو رہا تھا۔ گل خان نے دوست کو گلے لگا لیا۔ کئی سالوں سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ تھے اور آج تک جدائی کا موقعہ نہ آیا تھا اور اب جو وہ ایک دوسرے سے بچھڑ رہے تھے تو ہمیشہ کے لیے جدائی ان کے درمیان حائل ہو رہی تھی۔ آگے بڑھتے جوانوں کو دیکھ کے سیف الرحمٰن نے گل خان کو دھکا دیا۔ گل خان نے اِدھر اُدھر دیکھا اور ایک محفوظ جگہ پا کے اس کی طرف بڑھا۔ تمام جوان سامنے کی طرف سے پیش قدمی کر رہے تھے پیچھے کی جانب صرف ایک دو موجود تھے۔ اُس نے انہیں بندوق کا بٹ مار کے بے ہوش کر دیا۔ اور پائپ کے سہارے اس مکان سے باہر کی جانب کود گیا۔ اور پھر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا پہاڑی علاقہ ہونے کے باعث اُسے جلد ہی ایک پہاڑ میں پناہ مل گئی اور وہ وہاں بیٹھ کے فوج کے وہاں سے چلے جانے کا انتظار کرنے لگا۔

سیف الرحمٰن کافی دیر لڑتا رہا اور جب اس کی بندوق میں گولیاں ختم ہو گئیں تو ایک جوان کی گولی لگنے سے زخمی ہو گیا۔ اور پھر ایک گولی

سیدھی اس کے سینے میں آ لگی اور وہ ہمیشہ کی نیند سو گیا۔ چند فوجی جوان اس ہال نما کمرے میں داخل ہوئے تو وہاں صرف اس کی لاش موجود تھی۔ لاش کو کسٹڈی میں لے لیا گیا اور بچوں کو فوجی جوان ایک گاڑی میں بٹھا کر لے گئے۔ سیف الرحمٰن کی لاش کے علاوہ وہاں جو جو اشیاء موجود تھیں انہیں بھی تحویل میں لے لیا گیا۔ اس گھر نما سنٹر میں بہت سے شدت پسندوں کی لاشیں پڑیں تھیں اس کے علاوہ ایک دو جوانوں کی شہادت کی بھی خبر تھی تقریباً ایک دو ہی زخمی بھی تھے جنہیں جلد از جلد ہسپتال میں پہنچانے کا حکم دیا گیا۔

جہاں فوج کے لیے یہ ایک کامیابی تھی وہاں شدت پسندوں کے لیے ناکامی۔ گل خان پہاڑ میں چھپا اپنے ساتھیوں کی ہلاکت کے بارے سوچ رہا تھا کہ اُسے سیف الرحمٰن کی یاد آ گئی جب وہ چھوٹے تھے۔

"گل خان یہ بندوق ہمیں دے دو......"

"ارے یار چھوڑو رہنے دو...... تم اس کا کیا کرو گے"

"ہم اس کو چلانا سیکھیں گا...... "

گل خان نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا کرو گے چلا کے؟"

"ہم تمہارا زندگی کو بچائے گا......"

"ہمارا زندگی کو......"

گل خان پھر مسکرا دیا۔

"اپنا زندگی کی بات کرو...... تم ہمارا خاطر بھلا اسے کیوں چلائے گا؟"

"مگر ہم تم سے وعدہ کرتا ہے...... ہم تمہارا زندگی کی خاطر اُس کو چلائے گا......"

گل خان ہنس دیا۔

"تم نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا...... ہم غلط تھا...... تم صحیح تھا۔"

اس کی آنکھیں ایک دم بھیگ گئیں۔ وہاں سے اُٹھا اور گرتا گراتا سنٹر پہنچ گیا۔ مگر اس کے پہنچنے سے قبل ساری اطلاع کمانڈر تک پہنچ چکی تھی۔ جب وہ پہنچا تو قاری صاحب کو اپنا منتظر پایا۔

"ہم تمہارا بچ جانے پر بہت خوش ہے تم ایک بہادر جوان ہو ہمیں جہاں تمہارا بچنے کا خوشی ہے وہاں مرنے والوں کا افسوس بھی...... مگر ہمارا مشن میں یہ سب تو ہوتا رہتا ہے"۔

رات کو گل خان سنٹر سے نکلا تو اسفند نے اُسے دیکھ لیا۔ وہ اس وقت اس حال میں اُس کے یہاں سے جانے پر بہت حیران تھا۔ اس لیے اُس نے اس کا پیچھا کرنے کا فیصلہ کیا۔ گل خان رات کے اندھیرے میں انہی تنگ و تاریک راستوں سے ہوتا ہوا اُس اندھیری کوٹھری میں پہنچ گیا۔

اسفند بھی اس کے پیچھے ہی تھا۔ جب وہ اندر داخل ہوا تو اسفند باہر کھڑا ہو گیا۔ پہاڑ کے اندر بنی ہوئی اس کوٹھری میں صرف ایک دیا جل رہا تھا اس لیے اُسے اندر موجود افراد یا اشیاء کا اندازہ نہ ہو پایا پھر وہ اندر جا بھی تو نہ سکتا تھا۔ گل خان چند قدم لینے کے بعد رُک گیا۔

''تم آ گیا گل خان؟''

''جی کمانڈر......''

''تمہارے پہنچنے کا ہمیں خوشی ہے...... تم ہمارا بڑا کام کا آدمی ہے......''

''ہمارا واسطے کیا حکم ہے؟''

''تم چند روز آرام کرو...... اپنا بندہ تیار کرو لیکن فی الحال ایک دو روز کوئی حملہ نہیں''

''ٹھیک ہے......''

گل خان انہی قدموں کے ساتھ واپس لوٹ آیا۔ اس کے باہر نکلنے سے قبل اسفند نے خود کو چھپا لیا۔ اور پھر اُسی کا پیچھا کرتے ہوئے وہ واپس سنٹر پہنچ گیا۔ اسے اس شخص کی آواز جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ مگر یاد نہ آ رہا تھا کہ یہ کون ہے اور اُس نے اس کی آواز کہاں سنی ہے۔ اس نے ذہن پر بہت زور ڈالا تب اُسے یاد آیا کہ ایک بار جب وہ گل خان سے بات کرنے اس کے کمرے کی طرف آیا تو اس نے یہ آواز سنی تھی۔ مگر تب بھی وہ اس کا چہرہ نہ دیکھ پایا تھا اور آج بھی۔ اب اُسے اس شخص کے بارے تجسس ہونے لگا اور اس نے اس کے بارے جاننے کا فیصلہ کر لیا۔ ادھر گل خان اور سیف الرحمٰن کے ٹھکانے پر حملے کے بعد ہر ایک کو شک کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ اب تو وہ اس پر بھی تھوڑا تھوڑا سا شک کرنے لگے تھے۔ مگر ابھی تک انہیں کوئی ثبوت نہ مل پایا تھا لہٰذا وہ خاموش تھے۔



''ہمارا آج کا پروگرام دعوت دین کے اصول اور ایک مبلغ کے اوصاف پر مبنی ہے...... ہمیں آپ کے بہت سے خطوط موصول ہوئے جن میں آپ نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے بارے بتانے کا کہا ہے...... اس سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ ایک مبلغ جو نیکی کا حکم دے رہا ہے اور برائی سے منع کرتا ہے اس کے اوصاف کونسے ہیں...... اور دعوت دین کے اُصول کیا ہیں...... دعوت دین کے اُصول جاننے سے قبل اس کا مطلب یعنی معنی ومفہوم سمجھنا ضروری ہے...... دعوت کے معنی ہے بلانا...... اور دین سے مراد اسلام ہے...... یعنی لوگوں کو دین اسلام کی طرف بلانا دعوت دین کہلاتا ہے...... اس کے لیے تبلیغ، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، ابلاغ جیسے الفاظ بھی استعمال کیے جاتے ہیں...... دعوت دین کے لغوی معنی ہیں...... اچھی طرح پہنچانا، اصطلاح میں اس سے مراد بھلائی اور نیکی کی باتیں اور دین کے احکام بندوں تک پہنچانا...... یہ مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لیے ہوتی ہے...... غیر مسلم کو دعوت دین پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے بنیادی اصول وضاحت سے پیش کر کے اسے غور وفکر کی دعوت دی جائے تاکہ وہ اسلام کی حقانیت تسلیم کر کے حلقہ بگوش اسلام ہو جائے...... مسلمانوں کو دعوت دین پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی عقائد سے آگاہ کیا جائے...... دعوت کا طریقہ بتلایا جائے...... زندگی گزارنے کے لیے دین کے احکام بتلائے جائیں...... اچھے اور بُرے اعمال سے آگاہ کیا جائے...... ان

میں جو بدعملی اور فسق و فجور پیدا ہو چکا ہے...... اسے ترغیب و ترتیب سے ختم کیا جائے...... ہمارے دین میں اس کی بہت اہمیت ہے۔ سورۃ التوبہ کی آیت ۷۱ میں فرمایا گیا ہے۔"

"اگر مومن ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کو معروف کا حکم دیتے اور منکر سے منع کرتے ہیں۔"

مگر معروف کا حکم دینا اور منکر سے منع کرنے کے کچھ اُصول ہیں انہیں دعوت دین کے اصول یا طریق کار کہا جاتا ہے...... ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"اپنے پرودگار کی راہ کی طرف لوگوں کو حکمت اور عمدہ نصیحت سے بلائیں اور ان سے صرف عمدہ طریقے سے ہی بحث (مناظرہ) کیجیے۔"

چنانچہ دعوت دین کے اُصولوں میں پہلا اُصول حکمت ہے...... جس کا مطلب ہے کہ مبلغ کا کام صرف ایک پیغام اور کلام لوگوں کے کانوں میں ڈالنا ہی کافی نہیں بلکہ ماحول کو دیکھ کر ایسے انداز میں بات کی جائے...... کہ قبول کرنا آسان ہو...... ہمدردی اور خیر خواہی کے ساتھ کسی کا نیک کام کی طرف بلانے کو موعظت کہا جاتا ہے...... جس کے ساتھ حسنہ کی قید بھی لگتی ہے...... مخاطب کو یہ محسوس نہ کرایا جائے کہ بتلانے والا بڑا ماہر اور عالم ہے اور دوسرا شخص جاہل ہے......۔

اگر نوبت مناظرہ اور مجادلہ تک پہنچ جائے تو مناظرہ اچھے طریقے سے ہونا چاہیے...... نرمی، خیر خواہی اور حسن خطاب کو نظر انداز نہ کیا جائے...... غصہ اور نفس کی بڑائی پیش نظر نہ ہو...... دین کو ہمیشہ آسان کر کے پیش کیا جائے...... اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم اور شفقت و محبت کے بیان سے لوگوں کے دلوں کو پُر امید اور مسرور کیا جائے...... بات بات پر اللہ کی قہاری اور جباری کا ذکر کر کے دلوں کو مایوس اور خوف زدہ نہ کیا جائے...... دلوں کو ملانا ایک اہم اُصول ہے...... یعنی جس شخص کو اسلام کی طرف مائل کرنا ہو اس کے ساتھ محبت و شفقت...... امداد و اعانت اور غم خواری و ہمدردی کا سلوک کیا جائے...... اگر ایک مسلمان کو دعوت دین پیش کی جا رہی ہو تو ایسا نہ ہو کہ اس کی مذمت شروع کر دی جائے...... عملی نمونہ ایک اور اُصول ہے...... جس چیز کی دوسروں کو دعوت دی جا رہی ہو خود اس پر عمل پیرا نہ ہوا جائے تو...... دعوت دین بے اثر رہتی ہے...... جب مسلمانوں کو نیکی کی تلقین کی جائے تو ان کا احترام کیا جائے...... ان کی کسی غلطی کی وجہ سے حقیر اور ذلیل نہیں سمجھنا چاہیے...... اور یہ کہ کسی سے بات قبول کرانے کے لیے سختی اور جبر کا استعمال اسلام میں جائز نہیں...... کیونکہ جبر سے نفاق پیدا ہوا ہے نہ کہ اسلام...... قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

"دین میں کوئی جبر نہیں۔ مبلغین کو چاہیے کہ وہ بھی اس اصول کو اختیار کریں اور کسی پر کوئی جبر روا نہ رکھیں اس کا کچھ فائدہ نہیں......"

مبلغین کے اوصاف بیان کرنے کے ساتھ ہی میں پروگرام کا اختتام کرنا چاہوں گا...... عملی نمونہ ایک مبلغ کا ایک وصف ہونا چاہیے...... اس کے علاوہ اخلاق، خوش اخلاقی، عجز و انکساری اس کی شخصیت کی خصوصیات ہوتی ہیں...... علم دین۔ لوگوں کی نفسیات جانے بغیر تبلیغ کا مقصد حاصل نہیں ہوتا...... دوسرے مذاہب کی بنیادی تعلیمات کا جاننا بھی ضروری ہے...... معاشرتی حالات، زبان پہ عبور، بیان کی صلاحیت اور عصر حاضر کے رجحانات سے آگاہی بہت اہمیت کی حامل ہے...... اس کا مقصد یہ ہے کہ سائنسی ترقی سے آج کے دور کے انسان کی سوچ میں جو تبدیلی آچکی ہے اُسے جان سکے...... اس دُعا کے ساتھ اجازت دیجیے کہ خدا تعالیٰ ہمیں دین کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے...... آمین...... خدا حافظ......"

اس پروگرام کو سننے والے ہر فرد کا کہنا تھا کہ اگر ایک مبلغ واقعی ان اوصاف کا حامل ہو اور وہ ان اُصولوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے دین کی دعوت دے تو یقیناً وہ کار آمد ثابت ہوگی.......۔

بشریٰ کا خیال تھا کہ دہشت گرد جو کہتے پھرتے ہیں کہ وہ نیکی کو پھیلانے اور برائی سے روکنے کے لیے حملہ کرتے ہیں اگر دعوت دین کے ان اُصولوں اور اوصاف کے حامل ہوتے تو وہ اس قسم کی حرکات نہ کرتے۔ بے گناہوں کا قتل نہ کرتے اور نہ ملک میں بدامنی کی فضا قائم کرتے۔ رضیہ بھی اپنے بیٹے آصف کی اس مشن میں شمولیت پر بہت خوش تھی اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کررہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بیٹے کو اس مقصد کے لیے چنا۔ رفعت آمنہ کو خوش دیکھ کے خوش ہورہی تھی اور شاہد اپنی ماں کے چہرے پر پھیلی اس مسکراہٹ پر خوش تھا جو اس بات کی دلیل تھی کہ وہ ایک نیک کام میں حصے دار ہے۔

آگاہی مشن کی مقبولیت میں دن بہ دن اضافہ ہوتا چلا جارہا تھا۔ اور اس میں آمنہ اس کے ساتھیوں اور ان سیلر ٹیز کا بہت بڑا حصہ تھا جنہوں نے ان کی اس کاوش میں اپنا کردار ادا کیا۔ ان سب کا خیال تھا کہ اتنی بڑی کامیابی نے آمنہ کو اب ہمیشہ کے لیے ماضی سے نکال دیا ہے اب وہ حال میں رہنا سیکھ گئی ہے...... مگر اس کی ظاہری حالت اور گرتی صحت اُنہیں اپنے خیال کو یقین میں بدلنے نہ دیتی تھی۔ جب بھی وہ آمنہ سے پوچھتے کہ تم ٹھیک تو ہو وہ فوراً کہتی الحمدللہ %100 صحت مند۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی زندگی کی ڈور آہستہ آہستہ اس کے ہاتھ کو کاٹ رہی ہے اور جانے کب یہ ڈور ان زخمی ہاتھوں سے چھوٹ جائے۔ مگر وہ اس راز میں کسی کو بھی شامل کرنے کے لیے رضامند نہ تھی۔ سب کے سامنے یوں رہتی جیسے اُسے کوئی دُکھ کوئی پریشانی نہیں وہ سب بھول بھال بیٹھی ہے۔

اب وہ نہ تو بات بہ بات آنسو بہاتی نہ ماضی کی کسی یاد کا تذکرہ کرتی۔ بلکہ سب کے ساتھ ہنستی کھیلتی۔ بڑھ چڑھ کے کام کرتی۔ شاہد کی کوئی بات بھی اُسے گراں نہ گزرتی اس بات نے اُسے یقین دلا دیا تھا کہ وہ اُسے چاہنے لگی ہے۔ اور اس کے دل میں یہ فیصلہ کرلیا کہ اب کے عامر گھر آیا تو وہ ماں کو لیکر اُس کے پاس جائے گا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آمنہ کو اپنے گھر کی زینت بنالے گا۔

ہر گزرتا دن اس کے ماضی میں شامل ہو کے ماضی کی کتاب کو لمبا کرتا جارہا تھا۔ سب کی خوشی کی خاطر اس نے چہرے پر مسکراہٹ تو سجالی تھی مگر آج تک کوئی ایسا دن نہ گزرا تھا جس نے یادوں کو اس سے جدا کیا ہو۔ طلوع ہوتا سورج اپنے ساتھ ماضی کو بھی لے آتا اور سورج کی طرح وہ بھی اس کی نظروں کے سامنے رہتا۔ رات کی تنہائی اور اندھیرا بھی اس کی سوچوں کو مزید گہرا بنادیتا۔ تنہا کمرے میں بیٹھی وہ ان بیتے لمحوں کو یاد کرتی جب زندگی یوں چپ چپ نہ رہتی تھی بلکہ ہر لمحہ گاتی گنگناتی تھی تتلیوں کی طرح باغوں میں پھولوں کے گرد رقص کرتی تھی۔ ہر روز وہ ان تتلیوں کے ساتھ ساتھ اڑتی تاکہ اپنی زخمی روح کو چند لمحوں ہی کے لیے تسکین دے سکے۔ آج بھی وہ انہی کے ساتھ اُڑ رہی تھی۔

ہاتھ میں اخبار تھامے وہ ماں کے سامنے چپ چاپ کھڑی ہوگئی۔ سکینہ پڑھی لکھی نہ تھی اس لیے اس کی بات کو نہ سمجھ پائی مگر جب آمنہ نے خوشی سے ماں کو گلے لگایا اور اپنی کامیابی کے بارے بتایا تو اُس کو بہت خوشی ہوئی۔ آمنہ کی بی۔ اے میں نمایاں پوزیشن اس کے لیے کسی قارون کے خزانے سے کم نہ تھی۔ اس کی کل کائنات آمنہ اور اسد تھے اور اب ان کی ہر خوشی اس کے لیے باعث مسرت تھی۔ سکینہ نے بیٹی کا ماتھا چوما اور ڈھیر

ساری دُعائیں دیں۔ مگر آمنہ صرف دُعاؤں سے ٹلنے والی نہ تھی۔

''ارے...... یہ کیا اماں صرف دُعائیں ہی دینگی ؟''

وہ ہنس دی اور پھر وہاں سے اُٹھ کے کمرے میں چلی آئی چند منٹوں میں جو وہ واپس پلٹی تو ہاتھ میں جیولری بکس تھا۔ آمنہ حیرت زدہ رہ گئی۔ کہ وہ جیولری کس لیے لائی ہیں۔ سکینہ نے جیولری بکس میں سے ائیر رنگ نکالے اور اس کے کانوں میں ڈال دیے۔ آمنہ کو جیولری سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ مگر ماں کی خوشی کی خاطر یوں کھلائی جیسے اس کی دلی مراد پوری ہوگئی ہو۔

''ماں میں ذرا بھائی کو دکھا آؤں...... اُن سے اپنا تحفہ بھی تو وصول کرنا ہے......''

''جاؤ...... جاؤ......''

اسد اپنے کام میں مگن تھا۔ آمنہ جا کے اُس کے سامنے کھڑی ہوگی۔

''بھائی میرے کانوں میں کیا ہے؟''

اس نے لاپرواہی سے پوچھا تو وہ روٹھ گئی اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی یا اپنے تحفے کی فرمائش کرتی اس نے اُسے آنکھیں بند کرنے کا کہا اور جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اس کے ہاتھ میں پھول تھا۔ اسد نے اصلی پھول کی ٹہنی پر کاغذ کا پھول لگا دیا تھا جب ٹہنی اس کے ہاتھ میں آئی تو وہ بچاری سمجھی اصلی پھول ہے اس لیے سونگھنے لگ گئی۔ خوشبو نہ پا کے آنکھیں کھولیں تو غصے سے آگ بگولہ ہوگئی۔

''بھائی آپ بہت بُرے ہیں...... پھول دیا بھی تو کاغذ کا...... نہ مہک نہ نزاکت...... جائیں میں آپ سے بات نہیں کرتی......''

''شکر ہے تحفے سے جان بچ گئی...... اگر روٹھتی نہ تو جان کی خلاصی ناممکن تھی۔''

بھائی کو یوں وہ کیسے جانے دے سکتی تھی۔ لہٰذا غصے اور ناراضگی کو نظر انداز کر کے تحفے کی فرمائش کرنے لگی۔ اسد نے کافی دیر تک اُسے خوب ستایا۔ مگر جب وہ تھک ہار گئی اور مایوس ہو کے اس کے کمرے سے جانے لگی تو اُس نے اُسے روکا۔ اب اس کی نظروں کے سامنے گلاب کے پھول کا ایک خوبصورت بوکے تھا۔ اُسے دیکھ کے وہ خوشی سے جھوم اُٹھی۔

''میں جانتی ہوں آپ مجھے ناراض نہیں دیکھ سکتے...... بھلا اتنا ستانے کی کیا ضرورت تھی پہلے ہی دے دیتے......''

''اگر پہلے دے دیتا تو تمہاری روتی شکل تو دیکھنے کو نہ ملتی......''

ہنستے ہوئے بولی۔ ''آپ بڑے چالاک ہیں...... خیر تھینکس......''

تھینکس کے ساتھ ہی وہ کمرے سے باہر چلی آئی۔ جب اس نے اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی تو وہ کمرے میں نہیں بلکہ باہر ٹہل رہی تھی۔ رفعت نے اُسے یوں ٹہلتے ہوئے دیکھا تو حیرت زدہ ہوگئی۔

''بیٹی سب خیر تو ہے نا!...... تم اتنی رات گئے یوں ٹہل رہی ہو؟''

اُس کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا اس لیے خاموش واپس کمرے میں آ گئی۔ اس کو یوں دیکھ کے رفعت کو فکر لاحق ہوگئی۔ اسے آمنہ میں وہی

تبدیلی نظر آئی جو اسد اور سکینہ کی وفات کے بعد فوراً اس کے اندر رونما ہوئی تھی۔ ایک ساعت کو اُسے یوں لگا کہ آمنہ کی حالت پاگلوں کی سی ہوگئی ہے۔ اُس نے اس بارے بات کرنا چاہی مگر جب اس کے روم کا دروازہ کھولا تو اُسے سویا دیکھ کے واپس لوٹ گئی۔



اسفند کو اب اپنا وجود خطرے میں دکھائی دے رہا تھا۔ دن بہ دن حالات خراب ہوتے جا رہے تھے۔ ان کی ناکامیاں بڑھتی چلی جا رہی تھیں اس وجہ سے وہ نہ صرف ہر ایک کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے بلکہ انہوں نے ہر شخص پر نگرانی اور سختی بڑھا دی۔ اسفند کے لیے یہاں سے نکلنا اور معلومات پہنچانا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ موبائل کو استعمال کرنے میں بھی اُسے بہت زیادہ احتیاط سے کام لینا پڑ رہا تھا۔ بلکہ کئی روز تو موبائل پر بات کرنا ہی محال ہوگیا۔ اس صورت حال سے نپٹنے اور یہاں سے کسی نہ کسی طرح نکلنے کے بارے وہ بیٹھا پلان بنا رہا تھا کہ بہادر بھاگا بھاگا اس کے کمرے میں آیا۔ وہ گھبرایا ہوا تھا۔ سانس بھی پھول رہا تھا۔ اس لیے بات کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ اسفند نے اُسے اپنے پاس بٹھایا اور پھر اُسے آرام سے بات کرنے کی تاکید کی۔

"تم یہاں سے چلے جاؤ......"

اسفند بہت حیران ہوا کہ آخر وہ یہ کیوں کہہ رہا ہے۔

"کیا مطلب؟"

"وہ تم پر شک کرنے لگا ہے......"

"کیسا شک؟"

"وہ سمجھتا ہے کہ تم مخبر ہو......"

"مخبر...... کس کا مخبر؟"

"پولیس کا......"

"مگر تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟"

"ہم پانی پینے کے واسطے جا رہا تھا کہ گل خان کو ایک نئے بندے سے باتیں کرتے سنا......گل خان سے وہ اجنبی کہہ رہا تھا اسفند مخبر ہے ......اس کا بندوبست کرو......گل خان نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ اگر تم مخبر نکلے تو وہ تمہارا گلا کاٹ دے گا اس نے ایک دو روز تمہاری نگرانی کے بعد فیصلہ کرنے کا کہا ہے......اب کیا ہوگا؟"

اسفند کا شک بھی بہادر کی باتیں سننے کے بعد یقین میں بدل گیا۔ صورت حال واقعی کافی خطرناک صورت اختیار کر چکی تھی مگر اسفند نے خود کو سنبھالا اور بہادر کو تسلی دی۔ کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

"ہم کہتا ہے تم بھاگ جاؤ......"

بہادر کی تجویز پر اسفند نے اس کا ماتھا چوما پیار کیا اور کہنے لگا۔

''ہم تم کو چھوڑ کے نہیں جائیگا......''

''ہم کو چھوڑ دو......ویسا بھی یہ ہم کو یہاں سے نہیں جانے دے گا......ہمارا زندگی اتنا قیمتی نہیں جتنا تمہارا زندگی......تمہیں سب کو بچانا ہے ......بھاگ جاؤ......''

''تم فکر مند مت ہو......اللہ بہتر کرے گا......''

''تم کہتا ہے تو انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا......''

اسفند کو اب ہر قدم پھونک پھونک کے رکھنا تھا۔ اسے بہت سے انسانوں کی زندگی کی پرواہ تھی ظلم و ستم کی روک تھام، ظلم و تشدد اور دہشت گردی کا خاتمہ اس کا اولین مقصد تھا اور اس کے حصول کے لیے وہ ہر طرح کی قربانی دینے کو تیار تھا۔ چاہے اُسے اپنی جان سے ہاتھ ہی کیوں نہ دھونے پڑے۔

☆

وہی سرسبز علاقہ اور اس میں اینٹوں اور گارے سے بنا وہی ٹوٹا پھوٹا سا کمرہ آج بھی اس کمرے میں کرسیاں اُسی ترتیب سے رکھی گئی ہیں۔ بہت سے لوگ ان پر بیٹھے کسی کی آمد کے منتظر ہیں۔ ان میں زیادہ تعداد فارنر کی ہیں البتہ انڈین بھی موجود ہیں۔ چند ساعتوں کے توقف کے بعد ایک فارنر اندر داخل ہوا۔ سب اس کی تعظیم کو کھڑے ہو گئے۔ اور پھر جوں ہی اس نے ''Sit down'' کہا وہ فوراً بیٹھ گئے۔ آج بھی دیوار پر دنیا کا نقشہ آویزاں ہے۔ اس فارنر نے جو ان کا کمانڈر ہے اور آج بھی اُنہیں اپنے ٹارگٹ کے بارے بتانے کے واسطے آیا ہے اسٹک اُٹھائی اور بولا۔

''This is our target''

آج بھی اس کی ٹارگٹ پلیس پاکستان تھا سب نے یک زبان کہا۔

''Yes, Sir we know''

اب اس نے اسٹک ایک جانب رکھ دی اور ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"Very well, you are playing your roles perfectlly. Pakistan will be weak an helpless like a patient, very soon"

سب سنجیدگی سے اس کی گفتگو سن رہے تھے۔

"But you have to perform your duties honestly. No doubt, it's an uphill task convince people, I mean to say to prepare, them.

ایک فارنر نے اُٹھ کے کہا۔

"But, Sir the word jihad has made it easy. Poverty, unemployment a unjustice are the main pillars. We can eaily construct our building.

کمانڈر نے اس کی باتوں کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"Yes, you are right. But your brilliant performance is admirable."

سب نے کہا

"Thanks Sir"

کمانڈر نے کہا۔

"No, need to thank, it's for our nation, for our country and specially for o bright future."

ایک اور فارنر کھڑا ہوا۔

"Sir, we bear a great lose in last few days."

کمانڈر نے تائید کی۔

"Yes, you are right. But it's part of war. We should not wory about it. Keep th thing in your mind All were muslims and Pakistani. It may be great lose but no great as you are thinking about. We can easily buy more people."

ایک انڈین بولا۔

"Sir , Those young ones who have been arrested were very important for us."

کمانڈر بولا۔

"Yes, you are right."

ایک فارنر بولا

"Sir, they were those who had to weaken Pakistan."

کمانڈر ہنس دیا۔

"Yes ...... yes, These young ones think they are fighting for Islam, for Allah How foolish they are! How foolish!

ایک انڈین بولا۔

"What is the next order." ''سر ہمارے لیے کیا آرڈر ہے؟''

"......"Continue your mission" ''اپنا مشن جاری رکھو......''

کمانڈر نے ایک شخص کو کھڑے پایا تو بولا:

"Have you any problem, william".

ولیم نے جواب دیا:

"یس سر............"

کمانڈر نے پوچھا۔

"What's the problem"

"Sir, I need more money and weapans".

"Don't worry william, don't worry. Your problem will be solved. You are very important person...... I appriciate your work...... you have done a lot for your country. ...... Your Kari Shahib role is remarkable very well ...... very well ....

اسفند جو کافی دیر سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ یہ سن کے حیران و پریشان رہ گیا۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ قاری صاحب ایک عیسائی شخص ہے جس نے پاکستان کو تباہ و برباد کرنے کے لیے ایک مسلمان کا روپ دھار رکھا ہے۔ وہ تو اس بات پر بھی حیران تھا کہ اس شخص نے کتنی چالاکی سے لوگوں کو اپنے چنگل میں پھنسا لیا تھا۔ کتنے بچے تھے جو اس کے مدرسے میں زیرِ تعلیم تھے۔ آج ہی وہ اس بات کو بھی سمجھ پایا تھا کہ قاری صاحب اتنے بچے کیسے ٹریننگ سنٹر لے آتے تھے۔ کس طرح والدین اپنے بچوں کو ان کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔ قاری صاحب کا روپ ہی اصل میں وہ پھندا تھا جس نے کتنے گلے کاٹ ڈالے تھے۔ کتنوں کو پھانسی پر لٹکا دیا تھا۔ کتنے اس پھندے میں پھنس کے سینکڑوں انسانوں کی موت کا باعث بن چکے تھے۔

وہ یہ تو جان گیا تھا کہ اورنگ زیب ایک لالچی انسان ہے اور اس نے صرف پیسے کی لالچ میں قاری صاحب کا ساتھ دیا تھا۔ مگر وہ اُن والدین پر حیران ہوتا تھا جو اپنے معصوم بچوں کو اس گھناؤنے جرم کا مرتکب بنا دیتے تھے۔ آج وہ یہ سمجھ گیا تھا کہ وہ والدین نہیں بلکہ قاری صاحب ہیں جو اِدھر والدین کو دھوکا دے رہا تھا تو اُدھر اُن معصوم بچوں کو جو شاید جہاد کی اصل روح کو بھی نہ سمجھتے تھے۔ جو یہاں آئے تو دین کی خدمت کو تھے مگر اہلِ اسلام کے لیے خطرہ بنتے جا رہے تھے۔ اور انہیں خبر بھی نہ تھی کہ وہ جنہیں اہلِ اسلام سمجھ کے ان کی ہر بات پر عمل کیے چلے جا رہے ہیں وہ دراصل منافق ہیں۔ اسلام کے دشمن ہیں۔ وہ عجیب و غریب کشمکش کا شکار تھا۔ اس کو ایک جانب ہٹا کے اس نے دوبارہ ان کی گفتگو سننے کی کوشش کی۔

Sir, No doubt, william is doing a great job, but he is doing mistake also.

"What kind of mistake"

"He is not aware of conspirasor"

اس کا لب و لہجہ فارنر کی طرح نہ تھا۔ بلکہ وہ ایشائن لگتا تھا۔ مخبر کا سنتے ہی اس کے دل و دماغ میں بہادر کی بات آ گئی۔

"وہ آپ پر شک کر رہا ہے......"

کمانڈر نے پھر کہا۔

"What do you mean?"

دوبارہ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

Sir, there is Asfand who is our enemy.

He is not only transfering our secrets but demaging us in different ways.

کمانڈر ایک دم سے گھبرا گیا۔

"What"

"یس سر"

کمانڈر نے ولیم کی طرف دیکھا۔

"What I am hearing"

ولیم نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"Sir, it's not possible, but, if anyone has been found guilty, he must face consequences."

کمانڈر نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"Go and investigate."

"اس کو تلاش کرو...... وہ ہمارا واسطے خطرہ ہے......"

جوں ہی اُردو زبان میں کمانڈر کی زبان سے یہ جملہ ادا ہوا اسفند ششدرہ گیا۔ قاری صاحب کا بھید کھلنے کے بعد ایک فارنر کی زبان سے اتنی اچھی اُردو سننا اس کے لیے باعث حیرت نہ تھا بلکہ پریشانی اور حیرت کی وجہ اس کی آواز تھی۔ اسفند کو لگا کہ اس نے یہ آواز پہلے بھی سنی ہے۔ مگر کب؟ کہاں؟ اور کیسے؟ اس کا جواب اس کے پاس نہ تھا۔ اس نے ذہن پر بہت زور ڈالا مگر بے حد کوشش کے بعد بھی اُسے کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ آخر کار اس نے غور و فکر کو چھوڑ کے جلد از جلد وہاں سے فرار ہونے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ اس میں سب کی بھلائی تھی۔

ابھی وہ زیادہ فاصلہ طے نہ کر پایا تھا کہ اسے بہادر مل گیا۔ وہ بھی اُسے ڈھونڈتا ڈھونڈتا اس جانب نکل آیا تھا۔ یہاں وہ اُسے یہ ہی خبر دینے آیا تھا کہ گل خان نے اُسے مارنے کا پروگرام بنا لیا ہے۔ اب تو اس کے پاس صرف ایک ہی حل تھا اور وہ یہ کہ وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ سے رابطہ کرے۔ بہادر نے اُسے جلد از جلد یہاں سے نکلنے کا مشورہ دیا۔ مگر اسفند جانتا تھا کہ بہادر کی جان بھی اب خطرے میں ہے۔ آخر بہت سوچ بچار کے بعد اُس نے بہادر کو ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ اُسے عینی شاہد بنا کے نہ صرف اس کی زندگی بچانا چاہتا تھا بلکہ بہت سے دوسرے لوگوں کی موت کے سامنے بھی بند باندھنا چاہتا تھا۔ وہ بہادر کو لیکر ڈیپارٹمنٹ پہنچا۔ افسران بالا کو تمام صورت حال سے آگاہ کرنے کے علاوہ جلد از جلد کسی کاروائی کی

تجویز بھی پیش کی۔ اس کے علاوہ انہیں اس بات سے بھی باخبر کیا کہ دہشت گردی میں غیر ملکی عناصر بھرپور حصہ لے رہے ہیں۔ قاری صاحب کی حقیقت سے آگاہ کرنے کے علاوہ کمانڈر کے چہرے سے بھی نقاب اُتار دیا۔ یہ ہی وہ لوگ تھے جو گل خان، اورنگ زیب اور مقامی لوگوں کو استعمال کر کے ملک میں دہشت گردی کی کاروائیاں کر رہے تھے۔ اسفند کے فراہم کردہ ثبوت کے علاوہ حکومت کو مقامی لوگوں کی طرف سے بہت سے خطوط بھی موصول ہوئے تھے ان خطوط میں انہوں نے حکومت سے مدد کی درخواست کی تھی۔

اِدھر اسفند کے غائب ہوتے ہی اس کی تلاش شروع ہوگئی مگر اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ حکومت پر اپنا دباؤ بڑھانے کو انہوں نے نہ صرف دھمکی آمیز خط ارسال کیے بلکہ خودکش حملوں میں بھی اضافہ کر دیا۔ عامر کے گھر لوٹتے ہی شاہد ماں کے ساتھ ان کے گھر آ گیا۔ مگر عفت نے بیٹے کی ضد اور بے حد اصرار کے باوجود فی الوقت شادی بیاہ کے معاملے کو چھیڑنے سے اجتناب کیا۔ اس کا خیال تھا کہ عامر چند دن آرام کرے تاکہ فیصلہ مثبت ہو۔ مگر رفعت کے کان میں شاہد کی خواہش ضرور ڈال دی۔ دو چار روز گزرنے کے بعد رفعت نے بیٹے کو شاہد کی خواہش سے آگاہ کیا۔ اس نے فوراً رضامندی شو کر دی۔ مگر وہ کسی بھی حتمی فیصلے سے قبل آمنہ کی رائے جاننا چاہتا تھا۔ آخر کو اس کا فیصلہ ہی آخری فیصلہ قرار پانا تھا۔

موقعہ پا کے دونوں ماں بیٹا اس کے کمرے میں آئے مگر اس کی صحت کافی بگڑ رہی تھی۔ اس لیے بات کرنا مناسب نہ سمجھا۔ عامر نے اُسے ڈاکٹر کے پاس چلنے کا کہا۔ مگر اس نے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ ان کی تسلی کو یوں ایکٹ کر کے دکھایا جیسے وہ کبھی بیمار ہی نہ ہوئی ہو۔ دونوں ماں بیٹے نے بہت اصرار کیا مگر وہ کسی صورت بھی ان کی بات ماننے کو تیار نہ تھی۔ دن بہ دن اس کی صحت بگڑتی جا رہی تھی۔ مگر سب کے کہنے کے باوجود وہ اس بات کو ماننے کو تیار نہ تھی۔ بلکہ ان کی نظروں سے بچنے کے لیے اس نے خود کو اور زیادہ مصروف کر لیا۔

چند روز گزرنے کے بعد عامر نے آمنہ سے شاہد اور اس کی ماں کی خواہش کا اظہار کیا۔ تو اس نے چند روز کی مہلت مانگی۔ جو اس نے بخوشی دے دی۔ آمنہ دن رات ریکارڈنگ میں مصروف رہتی۔ ایک لمحے کو بھی وہ فارغ رہنا نہ چاہتی تھی۔ ایک روز وہ کافی دیر سے گھر لوٹی اور آتے ہی کمرے میں چلی گئی۔ رفعت کو آج اس کی طبیعت بہت زیادہ خراب لگ رہی تھی۔ اس لئے وہ بھی اس کے پاس چلی آئی۔ وہ بیڈ پہ بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔ وہ اس کے قریب گئی۔

"بیٹی......سب ٹھیک ہے نا!......تم آج مجھے اچھی نہیں لگ رہی......سب خیر تو ہے نا!"

مگر آمنہ تو اس کی کسی بات کا جواب ہی نہ دے رہی تھی۔ آخر اس نے اسے ہلایا تو وہ بے ہوش تھی۔ جلدی سے عامر کے کمرے میں آئی اور آمنہ کے بارے بتایا۔ دونوں ماں بیٹا اس کو ہسپتال لے گئے۔

شاہد سو رہا تھا کہ فون بجا۔ اتنی رات کو فون وہ حیران تھا آخر آنکھیں ملتے ملتے ریسیور اٹھایا۔

"ہیلو......"

"ہیلو شاہد......میں عامر بات کر رہا ہوں......"

"is everything alright

''آمنہ کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے......''

''آپ اس وقت کہاں ہیں؟''

''میں سروسز ہسپتال میں ہوں تم جلدی سے آجاؤ......''

شاہد نے فوراً بستر چھوڑا اور گاڑی لیکر ہسپتال پہنچ گیا۔عفت نے بلایا اور پوچھنے کی کوشش کی مگر وہ اس قدر جلدی میں تھا کہ کسی بھی سوال کا جواب نہ دے سکا آمنہ کی طبیعت بہت خراب تھی ساری رات کانٹوں پہ گزاری۔صبح جو ہوئی تو اُسے ہوش آگیا تو انہوں نے خدا کا شکرادا کیا۔اب ڈاکٹرز نے انہیں آمنہ سے ملنے کی اجازت دے دی۔عامر رفعت اور شاہد آمنہ کے پاس تھے۔

شاہد نے اسے ہنسانے کو کہا''آپ نے تو ہماری جان ہی نکال دی......بھلا ایسا بھی مذاق کرتے ہیں۔''

وہ تھوڑا سا مسکرائی۔

اسے مسکراتا دیکھ کے عامر نے کہا۔''یوں ہی مسکراتی رہا کرو......ہمیں تمہاری بہت ضرورت ہے......''

رفعت کی تو آنکھیں بھیگ گئیں۔اسے روتا دیکھ کے آمنہ نے کہا''آئی۔ایم۔سوری آنٹی۔میں نے آپ کو بہت تنگ کیا......''

جوں ہی صائمہ اور آصف کو آمنہ کی بیماری کی خبر ملی وہ بھی اس کی عیادت کو چلے آئے۔عفت بھی صبح ہوتے ہی ہسپتال پہنچ گئی۔سب اسے ہنسانے وخوش کرنے کی بہت کوشش کرر ہے تھے مگر اس کے ماتھے کے بل بتار ہے تھے کہ وہ بہت تکلیف اور کرب سے گزر رہی ہے۔اس کی حالت دیکھتے ہوئے عامر ڈاکٹر کے پاس گیا اور اس سے آمنہ کے بارے پوچھا تو ڈاکٹر نے کہا۔

''عامر صاحب میں فی الحال کچھ بھی کہنے کی پوزیشن میں نہیں کچھ ٹیسٹ کرنے کے بعد ہی آپ کو اصل صورتِ حال سے آگاہ کیا جاسکتا ہے۔''

دوپہر کو سب اُس کے پاس ہی تھے کہ اچانک اس کی طبیعت پھر سے بگڑ گئی۔عامر جلدی سے ڈاکٹر کو بلا کے لایا۔ڈاکٹر نے اس کا چیک اپ کرنے کے بعد اسے انجکشن لگا دیا۔اس کے بعد وہ سوگئی۔عامر نے سب کو گھر جانے کا مشورہ دے دیا۔سب چلے گئے مگر شاہد نے جانے سے انکار کر دیا بلکہ عامر سے بھی چند گھنٹوں کے لیے آرام کرنے کا کہہ دیا۔مگر وہ وہیں رہنا چاہتا تھا۔جب عامر ڈاکٹر کے پاس تھا تو آمنہ جاگ گئی اس وقت شاہد اس کے پاس موجود تھا اُس دیکھ کے بولا''اب طبیعت کیسی ہے؟''

''میں ٹھیک ہوں......''

''پلیز جلدی سے صحت یاب ہوجائیں......''

''کیوں؟''

''ارے یہ بھی کوئی پوچھنے والا سوال ہے آپ کی صحت یابی نے کتنے سارے معاملات کو روکا ہوا ہے......''

''میں نے اپنے تمام معاملات طے کر لیے ہیں......''

''مگر میرا معاملہ Pending ہے......''

"کونسا؟"

"آپ جانتی ہیں......"

آمنہ شاہد کو دیکھ کے رو دی۔

"ارے......ارے آپ رونے لگی......"

"آئی۔ایم۔سوری......"

"فاروث......"

"میں آپ کے لیے باعث مسرت نہیں ہو سکتی......"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"آپ نہیں سمجھے گے......مگر"

وہ پھر سے رونے لگی۔

"مگر کیا؟"

"کچھ نہیں......صائمہ اور آصف کہاں ہیں؟"

"انہیں گھر بھیج دیا ہے......"

"آپ میرا ایک کام کرینگے؟"

"کیوں نہیں"

"پلیز صائمہ اور آصف کو بلوا دیں......اور اگر ہو سکے تو آنٹی کو بھی......"

شاہد نے فوراً صائمہ اور آصف کو فون کر دیا۔رفعت پہلے ہی کھانا لے کے وہاں پہنچ گئی تھی عفت کو بھی گھر جا کے بے چینی سے محسوس ہوئی اس سے رہا نہ گیا اور وہ بھی ہسپتال آ گئی۔جوں ہی سب آ چکے تو آمنہ نے صائمہ کو اپنے قریب بیٹھنے کو کہا۔جب وہ اس کے قریب آ گئی تو وہ کہنے لگی۔

"میری ایک بات مانو گی......"

صائمہ نے کہا۔"کیوں نہیں"

آمنہ نے پرنم آنکھوں سے کہا۔"اسے میری التجا سمجھنا یا درخواست......"

صائمہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔"یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو......میں تمہاری دوست ہوں......تم حکم کر سکتی ہو......"

"It's my request"

''تم صحت یاب ہو جاؤ پھر سب......''

اس کی بات مکمل نہ ہو پائی تھی کہ وہ بول پڑی۔''جانے وقت مہلت دے یا نہ دے......''

''میں سمجھی نہیں......''

''صائمہ میں اپنے بھائی کی طرف سے تمہیں اس عہد سے آزاد کرتی ہوں...... جو تم نے کیا تھا......''

''کیا مطلب؟''

''آصف بھائی بہت اچھے ہیں تم سے بہت محبت کرتے ہیں محبت کو کبھی نہیں ٹھکرانا چاہیے تم ان سے شادی کر لینا......''

اس نے بولنا چاہا مگر آمنہ نے روک دیا۔

''یہ میری التجا ہے میرے بھائی کی خواہش ہے......''

''مگر......''

''پلیز صائمہ......''

شاہد نے اس جذباتی سین کو ختم کرنے کو کہا۔

''تم کونسا کہیں جا رہی ہو؟ صحت یاب ہو جاؤ پھر جو جی چاہے حکم دینا......''

آمنہ کی آنکھ بھر آئی۔ اس نے شاہد کو یوں دیکھا جیسے کہنا چاہ رہی ہو۔ میں تو کب کی یہاں سے رخصت ہو چکی ہوں۔ روح تو پہلے ہی پرواز کر چکی تھی۔ بس جسم موجود تھا آج اُسے بھی لے جا رہی ہوں......

''صائمہ وعدہ کرو...... پلیز...... اسے میری آخری خواہش سمجھ لو یا درخواست......''

صائمہ رونے لگی۔''پلیز ایسی باتیں مت کرو۔''

رفعت بھی رونے لگی۔ سب کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''آنٹی پلیز مجھے معاف کر دیجیے گا...... میں آپ کے لیے ہمیشہ مصیبت کا باعث رہی...... آپ کو دُکھ دیے......''

رفعت نے کہا۔''ایسی باتیں نہیں کرتے...... بچے بھی بھلا والدین کے لیے مصیبت کا باعث ہوتے ہیں......''

ایک دم آمنہ کا سانس اُکھڑ گیا شاہد بھاگا بھاگا ڈاکٹر کے پاس آیا۔ عامر بھی اس وقت ڈاکٹر سے آمنہ کے بارے بات چیت کر رہا تھا۔ جونہی شاہد نے کہا۔''آمنہ کی طبیعت ایک دم بگڑ گئی ہے......'' ڈاکٹر اور عامر بھاگے بھاگے آمنہ کے کمرے میں آئے۔ مگر اس وقت تک آمنہ کی روح پرواز کر چکی تھی۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد کہا۔

''آئی۔ ایم۔ سوری......''

رفعت نے روتے ہوئے عامر کی طرف دیکھا۔



آمنہ کو مرے ایک ماہ گزر گیا۔ عامر بیٹھا اُسی کے بارے سوچ رہا تھا کہ رفعت نے کہا۔

''بیٹا...... آمنہ نے مرتے وقت مجھ سے کہا تھا...... آنٹی عامر بھائی سے کہیے گا میرے بھائی کے قاتلوں کو ضرور پکڑیں ورنہ میری روح تڑپتی رہے گی۔''

اس نے کہا ''ماں میں بھولا نہیں......''

فوج نے پہاڑی علاقے میں آپریشن شروع کر دیا۔ اس آپریشن کے نتیجے میں بہت سے شدت پسند مارے گئے۔ بہت سے زخمی ہوئے اور بہت سے پکڑے بھی گئے۔ اورنگ زیب گل خان اور قاری صاحب بھی اس آپریشن میں لقمہ اجل بن گئے البتہ کمانڈر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

صائمہ اور آصف کی شادی ہو گئی۔ شاہد نے آمنہ کے مشن کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اور انہوں نے مل کر ایک NGO کی بنیاد بھی رکھی جس کا مقصد دکھی انسانیت کی مالی معاونت اور ان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا ازالہ کرنا تھا۔ انہیں انصاف دلانا تھا۔

ایک طرف آگاہی مشن جاری تھا تو دوسری طرف شر پسندوں سے جنگ جاری تھی۔ حکومت نے اس جنگ کو آخری شدت پسند کی موت تک جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔

